عمیرہ احمد

# آبِ حیات

آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایئر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص — سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سرا مل جاتا ہے۔
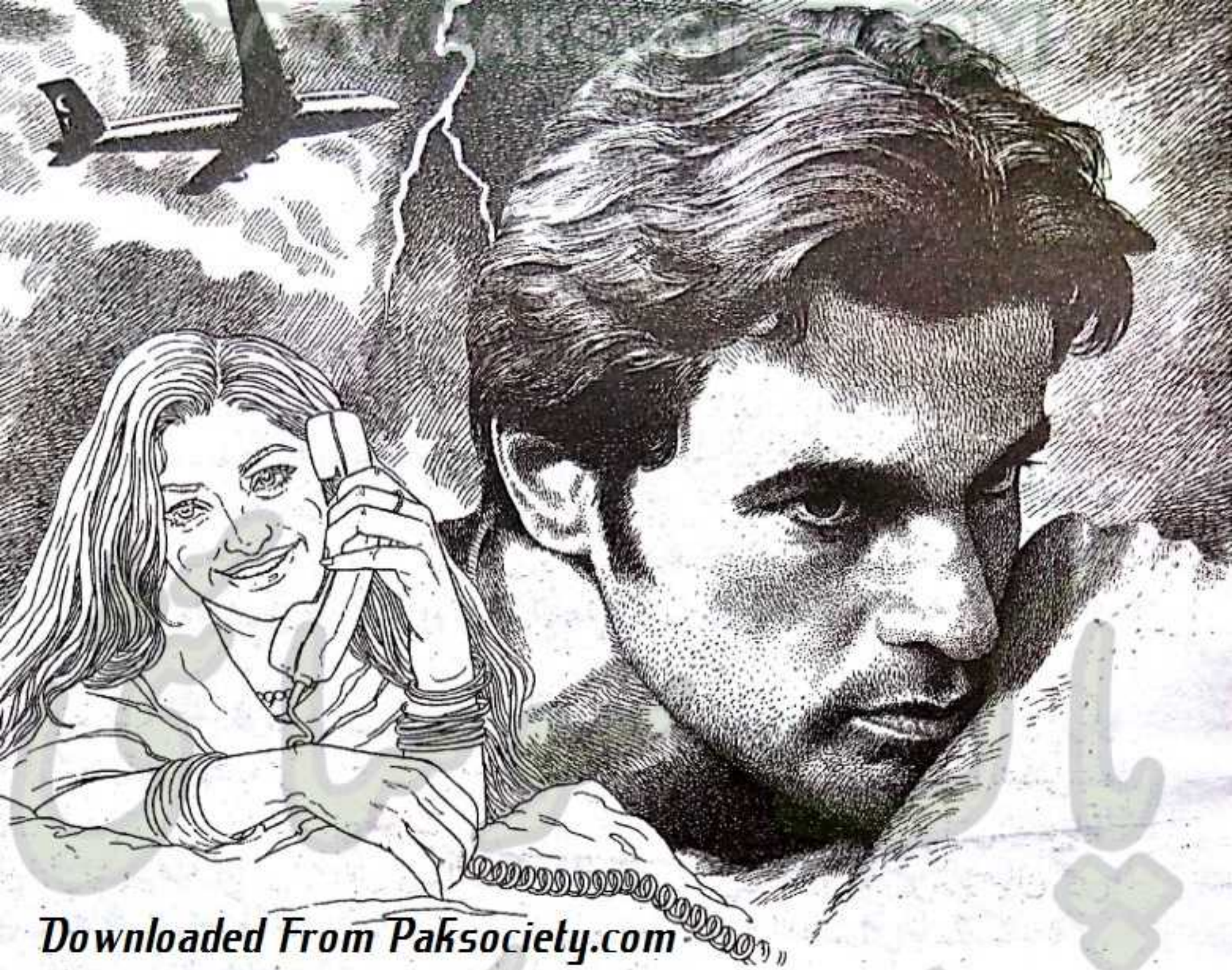
J۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ نینسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے، مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی، اس نے اس بار بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔



دسویں قسط

## حاصل و محصول

واشنگٹن میں ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹرز میں وہ سالار سکندر کی پہلی میٹنگ اور پریزنٹیشن نہیں تھی۔ وہ سینکڑوں بار نہیں تو درجنوں بار وہاں آچکا تھا مگر اپنی زندگی میں وہ کبھی کسی بورڈ روم میں دماغ پر اتنا بوجھ لے کر نہیں بیٹھا تھا جتنا اس دن بیٹھا تھا۔

وہ جہاز میں اپنی فلائٹ کے دوران دو گھنٹے سویا تھا اور باقی کا وقت اس نے لیپ ٹاپ پر اس پریزنٹیشن کو بار بار دیکھتے اور اس میں تبدیلیاں اور اضافے کرتے گزارا تھا، جو وہ اس میٹنگ میں پیش کرنے آیا تھا۔ وہ اس پریزنٹیشن کے شان دار ہونے کے باوجود یہ جانتا تھا وہ ایک ہارا ہوا کیس ایک ایسی جیوری کے سامنے پیش کرنے جا رہا تھا جو اس کیس کے حوالے سے تصویر کا کوئی دوسرا رخ دیکھنے پر تیار نہیں ہونے والی تھی، کیوں کہ تصویر کا وہ دوسرا رخ بے حد بھیانک تھا لیکن بھیانک ہونا اس سے نظریں چرانے کی وجہ نہیں تھی، بلکہ اس بھیانک رخ میں نظر آنے والا اپنا عکس تھا جو ان عالمی طاقتوں کے نمائندوں کے ضمیر کو سلانے کا باعث بن رہا تھا۔ سالار سکندر کو سانپوں کے بل میں بیٹھ کر ان کا زہر نکالنے کی تجویز پیش کرنی تھی، اور اسے اپنی کامیابی کے بارے میں کوئی خوش فہمی یا غلط فہمی نہیں تھی۔

اس کی فلائٹ واشنگٹن میں جس وقت پہنچی، اس کے ٹھیک چار گھنٹے کے بعد ورلڈ بینک کے "دربار" میں اس کی حاضری تھی۔ وہ ایک بار پھر ہوٹل کے کمرے میں سوئے بغیر کاغذات کا وہ پلندہ دیکھتا رہا جو اسے اس پریزنٹیشن کے ساتھ بورڈ روم میں تقسیم کرنا تھے۔ ان کاغذات کے ڈھیر کو وہ اگر کسی کورٹ میں پیش کر دیتا تو وہ کیس جیت جاتا، لیکن سوال وہاں یہ تھا کہ دنیا میں ایسی کون سی عدالت تھی جو اس کیس کو سنتی... کانگو کی عدالتیں ریڑھیاں تھیں، جن سے کچھ بھی خریدا جا سکتا تھا... انصاف کے سوائے... ایبا کا عالمی عدالت انصاف میں جانے کے وسائل نہیں رکھتا تھا... انصاف ملنا نہ ملنا تو خیر دور کی بات تھی... اور سالار سکندر ورلڈ بینک میں کام کرتا تھا، وہ اپنے پروفیشنل معاملات کو خفیہ رکھنے کا پابند تھا... اور ان سب حالات میں صرف ایک میڈیا تھا جس کا گلا گھونٹنے کی ورلڈ بینک کوشش میں تھا، کیوں کہ وہ پیٹرس ایباکا کی آخری امید تھا اور سالار کو پتا تھا ایباکا کسی بھی حد تک جا سکتا تھا، ان جنگلات کی تباہی کو روکنے کے لیے، جو اس کے قبیلے کی بقا کے ضامن تھے، لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ پیٹرس ایباکا کو اس کام سے روکنے کے لیے "مہذب دنیا" بھی کسی حد بھی تک جا سکتی تھی۔ اسے یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ پیٹرس ایباکا اس وقت نیویارک کے ایک اسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

اس بورڈ روم کا ماحول ویسا نہیں تھا جیسا اس نے ہمیشہ دیکھا تھا۔ سنجیدگی ہر بورڈ کا حصہ ہوتی تھی، لیکن جو اس نے اس دن وہاں دیکھی تھی، وہ سنجیدگی نہیں تھی وہ سرد مہری تھی اور وہ سرد مہری بورڈ روم میں بیٹھے صرف کسی ایک یا دو لوگوں کے انداز اور حرکات و سکنات سے نہیں جھلک رہی تھی... وہاں اس بورڈ روم میں بیٹھے سات کے سات لوگوں کے چہروں اور آنکھوں میں ایک جیسی ٹھنڈک اور سرد مہری تھی۔ ایسی سرد مہری جو کسی کمزور اعصاب کے انسان کو حواس باختہ کرنے کے لیے کافی تھی... بے تاثر چہرے، دوسرے کے اوسان خطا کر دینے والی نظریں... کسی دوستانہ مسکراہٹ سے عاری بھنچے ہوئے لب... جن پر اگر کبھی کوئی مسکراہٹ آتی بھی تو وہ ایک تضحیک آمیز اور توہین آمیز خم سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا تھا جو پل بھر رہ کر غائب ہو جاتا تھا۔

ایک بیضوی شکل کی میز کے گرد ٹانگوں پر ٹانگیں رکھے وہ پانچ مرد اور دو عورتیں اس کام کے ماہر تھے جو اس وقت کر رہے تھے... وہ ورلڈ بینک کے سالار سکندر جیسے کئی "باضمیر" ایمپلائز کا دھڑن تختہ کر چکے تھے جنہیں زندگی میں

تحفظ فراہم کبھی بیٹھے بٹھائے ورلڈ بینک میں کام کرتے کرتے پروفیشنل ethics (اخلاقیات) کا دورہ پڑتا' انسانیت یاد آنا شروع ہو جاتی... سالار سکندر ان کے سامنے کیا شے تھا۔ کم از کم اس میٹنگ کے آغاز سے پہلے وہ یہی سوچ کر آئے تھے۔ اجتماعی طور پر ان کی حکمت یہ نہیں بھی تھی تو بھی انفرادی طور پر ان کا طریقہ کار یہی تھا۔

وہ واشنگٹن ڈی سی میں ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹرز میں بیٹھے وہ لوگ تھے جو سمجھتے تھے وہ سرخاب کے پروں کے ساتھ پیدا ہوئے تھے اور ورلڈ بینک کے ساتھ ان کی کئی سالوں پر مشتمل ایسوسی ایشن اور ان کا کام ان کے اس ذہنی خلل کو اگر بڑھاتا جاتا تھا تو غلط بھی نہیں تھا... سالار سکندر اس آرگنائزیشن میں واحد ذہین اور قابل شخص نہیں تھا' وہاں بڑے بڑے طرم خان بیٹھے تھے جو اپنے کئی دہائیوں کے تجربے اور قابلیت سے کسی کے بھی پرخچے اڑا سکتے تھے... واشنگٹن آنے سے پہلے سالار سکندر کو اندازہ تھا وہ کیا بھگتنے جا رہا تھا۔ اس بورڈ روم کے اندر' لیکن جس کے بارے میں اسے اندازہ نہیں تھا وہ بورڈ روم سے باہر پیش آنے والے حالات اور واقعات تھے۔

وہ سات لوگ سالار سکندر کے کیریئر کے حوالے سے ایک ایک چیز جانتے تھے اور اتنی ہی معلومات وہ ان کے بارے میں رکھتا تھا۔ ان میں سے کسی کو کسی کے تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ سالار سکندر نے میٹنگ کے آغاز میں اس میٹنگ کی سربراہی کرنے والے ہیڈ کے ابتدائی کلمات بڑے تحمل سے سنے تھے۔ وہ سالار سکندر کی نااہلی' کوتاہیوں اور ناکامیوں کو ڈسکس کر رہا تھا۔ سالار نے باقی چھ لوگوں کی نظریں خود پر جمی محسوس کیں۔ وہ ایک چارج شیٹ تھی جو اس پروجیکٹ کا ذکر کرتے ہوئے وہ مائیکل فرینک اس پر لگا رہا تھا۔ سالار بھی اتنے ہی بے تاثر چہرے کے ساتھ ان الزامات کو سنتا رہا... اس میٹنگ کا ایجنڈا یہ نہیں تھا' لیکن اس کے باوجود سالار کے لیے وہ سب الزامات غیر متوقع نہیں تھے۔

"میں ان میں سے کسی بھی بات کا جواب دینے سے پہلے اس پروجیکٹ کے حوالے سے ایک پریزنٹیشن دینا چاہتا ہوں کیوں کہ میرا خیال ہے یہ پریزنٹیشن ان میں سے بہت سارے سوالات اور اعتراضات کا جواب دے دے گی' جو آپ لوگ مجھ پر کر رہے ہیں۔"

سالار نے مائیکل کے ابتدائی کلمات کے بعد اس کے کسی الزام کا جواب دینے کے بجائے کہا تھا۔ ان سات افراد میں سے کسی نے اسے اس پریزنٹیشن کو پیش کرنے سے روکا نہیں تھا لیکن ان میں سے کسی نے اس پریزنٹیشن کی نوعیت اور مقصد جاننے میں دلچسپی بھی نہیں لی تھی۔

سالار ایک کے بعد ایک سلائیڈ پروجیکٹر پر دکھاتا گیا۔ اس میں بہت سارے حقائق اور اعداد و شمار تھے اور اس کی اپنی ذاتی تحقیق بھی... وہ ان تمام چیزوں کو ان سلائیڈز کے ذریعے دکھا رہا تھا۔ ورلڈ بینک کے تعاون سے اگر وہ منصوبہ تو چڑھ جاتا تو افریقہ کی جنگلی حیاتیات کے ساتھ ساتھ پگمیز کی ممکنہ تباہی کے حوالے سے ہولناک اعداد و شمار... ورلڈ بینک کے چارٹر کی کون کون سی شقوں کی خلاف ورزی اس پروجیکٹ کے ذریعے ہو رہی تھی۔ ان جنگلات میں کام کرنے والے کمپنیز کی طرف سے کانگو کی مقامی آبادی کے استحصال کے ڈاکومینٹری ثبوت... اور انٹرنیشنل ڈونر کمپنیز اور این جی اوز کے خدشات پر مشتمل رپورٹس کے حوالے... اس کی پریزنٹیشن مکمل تھی' اور وہ اگر کسی اخبار یا نیوز نیٹ ورک کے ہاتھ لگ جاتی تو افریقہ میں وہ ورلڈ بینک کا سب سے بڑا اسکینڈل ہوتا۔ ان سات لوگوں نے وہ پریزنٹیشن بے تاثر چہروں کے ساتھ اپنی اپنی کرسیوں پر ساکت بیٹھے دم سادھے دیکھی تھی۔ لیکن آدھ گھنٹہ کی اس پریزنٹیشن کے ختم ہونے کے بعد ان ساتوں کے ذہن میں جو خدشہ ابھرا تھا وہ ایک ہی تھا... سالار سکندر کے ہاتھ میں وہ گرنیڈ تھا جس کی پن وہ نکال کر اسے ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا... مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ گرنیڈ دوسرے کی طرف پھینک دینے سے ان کی جان چھوٹ جاتی... وہ جہاں بھی پھٹتا وہیں تباہی پھیلاتا۔

پروجیکٹر کی اسکرین تاریک ہوئی۔ سالار نے اپنے لیپ ٹاپ کو بند کرتے ہوئے ان ساتوں لوگوں کے چہروں

پر نظر ڈالی مائیکل کے چہرے کو دیکھا جو اس کی صدارت کر رہا تھا۔ اتنے سالوں کی پبلک ڈیلنگ کے بعد وہ اتنا اندازہ تو لگا ہی پایا تھا کہ اس نے پریزنٹیشن تیار کرنے اور اسے یہاں پیش کرنے میں اپنا وقت ''ضائع'' کیا تھا۔

''تو تم اس پروجیکٹ پر کام نہیں کرنا چاہتے؟''

مائیکل نے اپنی خاموشی توڑتے ہوئے اس سے جو سوال کیا تھا اس نے بورڈ روم میں موجود لوگوں کے حوالے سے سالار کے خدشات کی جیسے تصدیق کی تھی۔

''میں یہ چاہتا ہوں کہ ورلڈ بینک کانگو میں اس پروجیکٹ کو ختم کردے۔'' تمہید اگر مائیکل نے نہیں باندھی تھی تو سالار نے بھی اس پر اپنا وقت ضائع نہیں کیا تھا۔

''تم مضحکہ خیز باتیں کر رہے ہو۔ اتنے سالوں سے شروع کیے جانے والے ایک پروجیکٹ کو ورلڈ بینک ایک چھوٹے سے عہدے دار کے کہنے پر ختم کردے کیوں کہ اسے بیٹھے بٹھائے یہ فوبیا ہو گیا ہے کہ بینک کانگو میں بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرنے والے پروجیکٹس کو سپورٹ کر رہا ہے۔''

وہ جولیا پرڈورڈ تھی جس نے بے حد تضحیک آمیز انداز میں 'سلگا دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ سالار سے کہا تھا۔ وہ اس کمرے میں مائیکل کے بعد سب سے سینئر تھی۔

''اگر میں فوبیا کا شکار یا یہ میرا دماغی خلل ہے اس حوالے سے تو یہ بیماری اس وقت ان جنگلات میں بسنے والے لاکھوں لوگوں کو لاحق ہو چکی ہے۔'' سالار سکندر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔

''تم کیا ہو۔۔۔؟ کس حیثیت میں کانگو میں بیٹھے ہو؟ ورلڈ بینک کے ایک ایمپلائی کے طور پر یا ایک ہیومن رائٹس ایکٹوسٹ کے طور پر؟ کانگو کے لوگ یا پگمیز تمہارا سردرد نہیں ہیں۔ تمہاری ترجیح صرف ایک ہونی چاہیے کہ تم مقررہ وقت پر اس پروجیکٹ کو مکمل کرو اور تمام اہداف کے حصول کے ساتھ۔''

اس بار بات کو ترشی سے کاٹنے والا الیگزینڈر رافیل تھا جو ورلڈ بینک کے صدر کے قریب ترین معاونین میں سے ایک تھا۔

''تم نے اپنا کانٹریکٹ پڑھا ہے وہ شرائط و ضوابط پڑھی ہیں جو اس کانٹریکٹ میں ہیں اور جن سے تم نے اتفاق کرتے ہوئے سائن کیے ہیں؟ تم اپنے کانٹریکٹ کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔۔۔ اور بینک تمہیں جاب سے نکالنے کا پورا اختیار رکھتا ہے اس کے بدلے میں۔''

اس کے لہجے کی رکھائی اس کا شناختی نشان تھی وہ اسی رکھائی اور بے مہری کے لیے جانا جاتا تھا۔۔۔ سالار وہاں موجود تمام لوگوں کو ان کی قابلیت کے علاوہ ان کی خصوصیات کے حوالے سے بھی جانتا تھا۔

''میں نے اپنا کانٹریکٹ پڑھا ہے اور صرف ایک بار نہیں کئی بار پڑھا ہے۔ میں نے ورلڈ بینک کا چارٹر بھی پڑھا ہے اور نہ میرے کانٹریکٹ میں نہ ورلڈ بینک کے چارٹر میں کہیں یہ تحریر ہے کہ مجھے کوئی ایسا کام کرنا پڑے گا جو بنیادی انسانی حقوق اور کسی ملک کے قوانین وضابطوں کی دھجیاں اڑا کر ہو سکے۔۔۔ اگر ایسی کوئی شق میرے کانٹریکٹ میں شامل تھی اور میں اسے نظرانداز کر بیٹھا ہوں تو آپ مجھے ریفرنس دیں۔۔۔ میں ابھی اپنے کانٹریکٹ میں اسے پڑھ لیتا ہوں۔ ای میل کی صورت میں میرا کانٹریکٹ میرے پاس موجود ہے۔'' اس نے لیپ ٹاپ ایک بار پھر آن کیا تھا۔

الیگزینڈر رافیل چند لمحوں کے لیے بول نہیں سکا۔ اس کے ماتھے پر بل تھے اور مسلسل تناؤ میں رہنے کی وجہ سے وہ مستقل جھریوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ وہ صرف اس وقت چہرے سے خوش گوار لگتا جب اس کے چہرے پر بھولے بھٹکے ہوئے مسکراہٹ آتی ورنہ کرختگی اس کے مزاج کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کا بھی ایک نمایاں حصہ تھی۔ اپنی کرنجی آنکھوں کو موڑتے ہوئے اس نے سالار سے کہا۔

"تم اپنے آپ کو ان لوگوں سے زیادہ قابل سمجھتے ہو جنہوں نے یہ پروجیکٹ کئی سال کی تحقیق کے بعد شروع کیا تھا۔ تم سمجھتے ہو جنہوں نے فزی بلٹی بنائی تھی۔ وہ ایڈیٹس تھے؟" وہ اب تضحیک آمیز انداز میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں... وہ ایڈیٹس نہیں تھے اور نہ ہی میں ایڈیٹ ہوں... وہ فیئو نہیں تھے اور میں ہوں' بات صرف اس دیانت کی ہے جو اس پروجیکٹ کی فزی بلٹی رپورٹ تیار کرتے ہوئے نظرانداز کی گئی ہے' ورنہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اس پروجیکٹ کی فزیبلٹی رپورٹ تیار کرنے والے اتنے عقل کے اندھے اور نااہل ہوں کہ انہیں وہ سب نظر نہ آیا ہو جو مجھے نظر آرہا ہے اور میرے علاوہ اور لاکھوں مقامی لوگوں کو نظر آرہا ہے۔ ورلڈ بینک کو اس پروجیکٹ کے حوالے سے دوبارہ انویسٹی گیشن کرنی چاہیے ایک انکوائری کمیٹی بنا کر... مجھے یقین ہے کہ اس کمیٹی نے دیانت داری سے کام کیا تو انہیں بھی یہ سب نظر آجائے گا جو مجھے نظر آرہا ہے۔" سالار سکندر نے رافیل کے ہتک آمیز جملوں کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میرے خیال میں بہتر ہے کہ اس ڈیڈلاک کو ختم کرنے کے لیے ایک کام کیا جائے جو واشنگٹن اور گومبے میں تمہارے آفس میں اس پروجیکٹ کے حوالے سے پیدا ہو گیا ہے۔"

اس بار بولنے والا ایل جاولز تھا۔ وہ واشنگٹن میں ورلڈ بینک کی میڈیا کو آرڈی نیشن کو مانیٹر کرتا تھا اور اس پروجیکٹ کے حوالے سے انٹرنیشنل میڈیا میں آنے والی خبروں کو دبانے میں اس کی قابلیت اور اثر و رسوخ کا بڑا عمل دخل تھا۔ "تم ریزائن کر دو جیسے تم نے پریزنٹیشن اور بینک کے ساتھ ہونے والی آفیشل خط و کتابت میں بھی آفر کیا تھا کہ اس پروجیکٹ کو تم اس طرح نہیں چلا سکتے۔"

وہ بڑے تحمل اور رسانیت سے سالار سکندر کو جیسے صلاح دے رہا تھا۔

"اگر یہ آپشن ورلڈ بینک کو زیادہ مناسب لگتا ہے تو مجھے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مجھے بھی اس مسئلے کا حل صرف میرا استعفیٰ نظر آرہا ہے' لیکن میں اپنے استعفے کی وجوہات میں اس پریزنٹیشن میں دیے جانے والے سارے اعداد و شمار شامل کروں گا اور اپنے تحفظات بھی لکھوں گا اور میں اس استعفے کو پبلک کروں گا۔"

بورڈ روم میں چند لمحوں کے لیے خاموشی چھائی تھی۔ وہ بالآخر اس ایک نکتے پر آگئے تھے جس کے لیے سالار سکندر کو کانگو سے واشنگٹن طلب کیا گیا تھا اور جو ورلڈ بینک کے گلے میں ہڈی بن کر پھنسا ہوا تھا۔ بورڈ روم میں بیٹھے ان سات لوگوں کے پاس صرف دو ٹاسک تھے یا سالار سکندر کو اس پروجیکٹ کو جاری رکھنے کے لیے تیار کیا جائے اور اس سے کہا جائے کہ وہ... وہ رپورٹ واپس لے لے جو اس نے ورلڈ بینک کو اس حوالے سے ارسال کی تھی یا پھر اس سے خاموشی سے استعفیٰ لیا جائے اور وہ استعفیٰ ذاتی وجوہات کی بنا پر ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ اور کوئی وجہ اس کے تحریری استعفے میں بیان نہیں ہونی چاہیے اور اب مسئلہ اس سے بڑھ گیا تھا۔ وہ نہ صرف استعفے میں یہ سب کچھ لکھنا چاہتا تھا بلکہ اس استعفے اور اس رپورٹ کو پبلک بھی کرنا چاہتا تھا۔

اگلے تین گھنٹے تک وہ بورڈ روم میں بیٹھے ہوئے سات افراد اس کے ساتھ بحث کر کے اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ انہوں نے اس پر ہر حربہ استعمال کر لیا تھا۔ جب دلیلوں سے کام نہیں بنا تھا تو انہوں نے بینک کے کانٹریکٹ میں استعفے کے حوالے سے کچھ شقوں کو اٹھا کر اسے دھمکی دی تھی کہ وہ جاب کے دوران اپنے علم میں لائے گئے تمام پروفیشنل معاملات کو صیغہ راز میں رکھنے کا پابند ہے اور اس استعفے کو پبلک کرنے اور اس رپورٹ کو میڈیا پر لانے پر اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جاسکتی تھی اور اسے نہ صرف مالی طور پر لمبا چوڑا ہرجانہ بھرنا پڑتا' بلکہ وہ آئندہ بینک یا اس سے منسلک کسی بھی چھوٹے بڑے ادارے کی جاب کرنے کے لیے نااہل قرار دے دیا جاتا۔ سالار سکندر کو پتا تھا یہ دھمکی نہیں تھی بہت بڑی دھمکی تھی۔ وہ بالواسطہ طور پر اسے بتا رہے

تھے کہ وہ اس کے پروفیشنل کیریئر کو کم از کم صرف ورلڈ بینک میں ہی نہیں بلکہ ان تمام انٹرنیشنل آرگنائزیشنز میں ختم کردیتے جو امریکا کی سرپرستی میں چلتی تھیں اور اسے پتا تھا وہ یہ کرسکتے تھے۔

وہ اب بین الاقوامی طور پر جس سطح پر کام کررہا تھا وہاں اس کے حوالے سے ایک چھوٹی سی قانونی چارہ جوئی بھی ایک اکنامسٹ فنانشل تجزیہ کار کے طور پر اس کی ساکھ تباہ کرکے رکھ دیتی۔ کوئی نامور ادارہ اس کے خلاف اس طرح کے الزامات پر ہونے والی قانونی چارہ جوئی کے بعد اسے کبھی نہ رکھتا کہ اس نے اپنے کانٹریکٹ میں موجود راز داری کی شق کی خلاف ورزی کی تھی۔ یہ اس کی ساکھ پر لگنے والا ایسا دھبا ہوتا جسے وہ کبھی بھی مٹا نہیں سکتا تھا۔ ان سات لوگوں نے اسے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ ورلڈ بینک اس کے ماتحت کانگو میں چلنے والے پروجیکٹس کو نئے سرے سے آڈٹ کروائے گا اور مالی اور دوسری بے ضابطگیوں کے بہت سے ثبوت نکال کر اسے بہت بے عزت کرکے اس عہدے سے فارغ کیا جاسکتا تھا جس پر وہ کام کررہا تھا' پھر اگر وہ اس پروجیکٹ کے حوالے سے اپنی رپورٹ لے کر میڈیا کے پاس بھی جاتا تب بھی اس کے الزامات اور رپورٹ اپنی حیثیت کھودیتے' کیونکہ بینک کے پاس جوابی طور پر اس کے خلاف کہنے کے لیے بہت کچھ ہوتا اور میڈیا اس کی اس رپورٹ کو ذاتی عناد اور بغض کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھتا۔ وہ نچلے درجے کی بلیک میلنگ تھی جس پر وہ اتر آئے تھے۔ سالار جانتا تھا وہ یہ کربھی سکتے تھے۔ اس کی فنانشل اور پروفیشنل دیانت داری پر ورلڈ بینک میں کبھی انگلی نہیں اٹھائی گئی تھی اور اس کا پروفیشنل ریکارڈ اس حوالے سے قابل رشک تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا اگر ورلڈ بینک کانگو میں اس کے آفس کے ذریعے چلنے والے پروجیکٹس میں کوئی سقم یا غبن تلاش کرنے پر مصر تھا تو وہ یہ ڈھونڈ ہی لیتے۔ وہ یا دنیا کا کوئی بندہ ورلڈ بینک کی آڈٹ ٹیم کی چھری سے نہیں بچ سکتا تھا اگر انہیں اس مقصد کے ساتھ بھیجا گیا ہو کہ انہیں کسی جگہ پر ہر صورت میں کوئی مالی بے ضابطگی تلاش کرنا ہی تھی۔

عام حالات میں سالار اس طرح کے کسی معاملے پر اپنے آپ کو اتنی مشکل صورت حال میں کبھی نہ ڈالتا' خاص طور پر اب جب اس کی ایک فیملی تھی۔ ایک بیوی تھی۔ کم سن بچے تھے۔ جو اس پر انحصار کرتے تھے لیکن یہ عام حالات نہیں تھے۔ پیٹرس ایباکا نے اسے ان سارے معاملات کے معاملے میں بے حس نہیں رہنے دیا تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی۔ وہ افریقہ اور پگمیز کے بارے میں جذباتی ہوکر سوچنے لگا تھا اور اس کی یہ ہی جذباتیت اس وقت اس کے آڑے آرہی تھی۔ خاموشی سے اس معاملے پر استعفیٰ دے کر اس سارے معاملے سے الگ ہوجانے کا مطلب صرف ایک تھا۔ وہ بھی اس جرم کا شریک کار ہوتا جو اکیسویں صدی کی اس دہائی میں کانگو میں پگمیز کے ساتھ کیا گیا ہوتا۔ وہ روکنے والوں اور احتجاج کرنے والوں میں شامل ہوکر تاریخ کا حصہ نہ بنتا مگر اس کا مسئلہ تاریخ کا حصہ بننے کی خواہش نہیں تھی' صرف ضمیر کی چبھن سے بچنے کی خواہش تھی جو زندگی کے کسی نہ کسی اسٹیج پر اسے احساس جرم کا شکار کرتی۔

دباؤ اور دھمکیاں جتنی بڑھتی گئی تھیں' سالار سکندر کی ضد بھی اتنی ہی بڑھتی گئی تھی۔ اگر سکندر عثمان اس کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ ڈھٹائی میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں تو وہ ٹھیک کہتے تھے۔ اس کا ایک عملی مظاہرہ اس نے واشنگٹن ڈی سی میں ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹرز میں سات لوگوں کے اس گروپ کے سامنے بھی پیش کردیا تھا جو سالار سکندر جیسے عہدے داران کو چٹکی بجاتے میں موم کی ناک کی طرح موڑ لیتے تھے۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' تین گھنٹے کے بعد بالآخر مائیکل نے اس کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے جیسے اس سے پوچھا تھا۔

''ایک غیر جانب دارانہ انکوائری ٹیم جو اس پروجیکٹ کا نئے سرے سے جائزہ لے اور اس کے بعد پگمیز اور ان بارانی جنگلات کے بہترین مفاد میں اس پروجیکٹ کو ختم کردے یا کوئی ایسا حل نکالا جائے جو ان جنگلات میں

رہنے والے لوگوں کے لیے قابل قبول ہو اور میں مقامی لوگوں کی بات کر رہا ہوں۔ وہاں کی مقامی حکومت اور اس کے عہدے داران کی بات نہیں کر رہا۔"

سالار سکندر نے جواباً" وہی مطالبہ دہرایا تھا جو اس کی پریزنٹیشن کی بنیاد تھا۔

"تمہاری قیمت کیا ہے؟" الیگزینڈر نے جواباً" جو سوال اس سے کیا تھا اس نے سالار سکندر کو جیسے بات کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اس ہیڈ کوارٹرز میں ہر نرم گرم گفتگو کی توقع کر سکتا تھا لیکن معاملات کو نمٹانے کے لیے اس جملے کی نہیں۔" کوئی تو ایسی چیز ہوگی جس کے لیے تم اپنے اس مطالبے سے ہٹ جاؤ۔ ہمیں بتاؤ وہ کون سی ایسی چیز ہے جس پر تم ہم سے سودا کر لو۔" رافیل نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ سالار نے ٹیبل پر رکھی اپنی چیزیں سمیٹنا شروع کر دیں۔



"میری کوئی قیمت نہیں ہے اور میں نے ورلڈ بینک کو اسی غلط فہمی میں جوائن کیا تھا کہ میں ایسے لوگوں کے ساتھ کام کروں گا جو دنیا میں اپنی پروفیشنل مہارت اور قابلیت سے جانے جاتے ہیں۔ اگر بروکرز کے ساتھ کام کرنا ہوتا، بیچنے، خریدنے اور قیمت لگانے والا تو اسٹاک ایکسچینج میں کرتا یا کسی بینک میں انوسٹمنٹ بینکنگ۔"

وہ نرم لہجے میں ان کے منہ پر جوتا مار گیا تھا اور اس جوتے کی چوٹ ان ساتوں لوگوں نے ایک ہی شدت کے ساتھ محسوس کی تھی۔ وہ سادہ زبان میں انہیں دلال کہہ رہا تھا اور وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ سالار سکندر کے ساتھ تو معاملات طے کرنے کے لیے انہیں، جن لوگوں نے بھیجا تھا، وہ سالار سکندر کے ساتھ معاملات طے ہونے کے بعد انہیں ان کا کمیشن مختلف شکلوں میں ادا کرتے۔ وہ ورلڈ بینک کے اندر بنی ہوئی لابیز کے نمائندے تھے، جو بظاہر مختلف ملکوں اور قوموں کی نمائندگی کرتے تھے، لیکن در حقیقت وہ ان بڑے کارپوریٹ سیکٹرز کے مفادات کا تحفظ کرتے تھے جو انہی اپنی حکومتوں کے عقب میں کار فرما ہوتے تھے۔

ان ساتوں لوگوں میں سے کسی نے مزید کچھ نہیں کہا تھا۔ تنتے ہوئے اور تنے ہوئے چہروں کے ساتھ وہ سب بھی اپنے کاغذات اور لیپ ٹاپ سنبھالنے لگے تھے۔ میٹنگ کسی نتیجے کے بغیر ختم ہو گئی تھی اور سالار کو اندازہ تھا کہ اس میٹنگ میں کی جانے والی باتوں کے بعد ورلڈ بینک میں اس کا کیریئر بھی ختم ہو گیا تھا۔

وہ میٹنگ ہیڈ کوارٹرز میں ہونے والی ہر میٹنگ کی طرح ریکارڈ ہوئی ہوگی۔ سالار کو اس کا اندازہ تھا لیکن اسے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ میٹنگ براہ راست کسی دوسری جگہ پر پیش بھی کی جا رہی تھی۔ سالار سکندر کے اس بورڈ روم سے باہر آنے سے پہلے اس سے نمٹنے کے لیے دوسری حکمت عملی طے ہو گئی تھی۔

الیگزینڈر رافیل بورڈ روم سے سالار کے پیچھے آیا تھا اور اس نے چند منٹوں کے لیے اس سے علیحدگی میں بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ سالار کچھ الجھا لیکن پھر آمادہ ہو گیا تھا۔ وہ کون سی بات تھی جو بورڈ روم میں نہیں کہی جا سکتی تھی اور اب اس ون ٹو ون میٹنگ میں کہی جاتی۔ وہاں وہ باتیں بھی کہہ دی گئی تھیں جو ورلڈ بینک جیسی معتبر آرگنائزیشن کے کسی فرد سے سالار انفرادی طور پر بھی سننے کی توقع نہیں رکھتا تھا چہ جائیکہ یہ کہ وہ اجتماعی طور پر اس سے کہی جائیں۔ وہ صرف مایوس نہیں ہوا تھا اس کی ہمت ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے ورلڈ بینک کو اس لیے اور ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے جوائن نہیں کیا تھا۔

الیگزینڈر رافیل کے آفس میں وہ اسی پیرائے کی کوئی مزید گفتگو سننے کی توقع کے ساتھ گیا تھا، مگر اپنے آفس میں الیگزینڈر رافیل کا رویہ اس کے ساتھ حیران کن طور پر مختلف تھا۔

"مجھے یہ ماننے میں کوئی شبہ نہیں کہ میں تمہاری رپورٹ سے بہت متاثر ہوا ہوں اور صرف میں نہیں پریذیڈنٹ بھی۔" اس کے پہلے ہی جملے نے اس کو حیران کر دیا تھا۔ وہ کافی کا کپ اس کے سامنے رکھتے ہوئے اپنا کپ لیے اپنی

سیٹ کی طرف چلا گیا تھا۔ پریذیڈنٹ سے مراد رالف ایڈگر تھا جو اس وقت ورلڈ بینک کا پریذیڈنٹ تھا اور رافیل اس کے قریب ترین معاونین میں سے تھا بلکہ کئی اعتبار سے اس کو پریذیڈنٹ کا دست راست سمجھا جاتا تھا۔ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے رافیل کا انداز بدل چکا تھا۔ اس کے چہرے کی کرختی ہونٹوں کے اس خم کی وجہ سے کچھ کم ہو چکی تھی جسے صرف ڈکشنری میں مسکراہٹ کہا جاتا تھا لیکن اس کا مقصد وہ نہیں تھا جو مسکراہٹ کا مطلب ہوتا تھا۔ الیگزنڈر رافیل اگر دنیا میں کسی کے ساتھ وفادار اور دوست تھا تو وہ اس کا کتا تھا اور صرف اس کتے کو دیکھ کر اس کے چہرے پر کبھی سچی مسکراہٹ آئی ہوگی' ورنہ دوست نظر آنے کی کوشش ہر اس بندے پر ناکام رہتی جو الیگزنڈر کو جانتا تھا اور سالار الیگزنڈر رافیل کو نہ صرف جانتا تھا بلکہ اس وقت اس کے اور اس کے کتے کے بارے میں کچھ اس طرح کی باتیں سوچ رہا تھا جنہیں وہ رافیل کے سامنے دہرا نہیں سکتا تھا' لیکن اس کے اس بدلے ہوئے رویے اور انداز نے اسے چوکنا کر دیا تھا۔ کافی کا گھونٹ لیے بغیر اور پلکیں جھپکائے بغیر وہ رافیل کی گفتگو سنتا رہا جو کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے بڑے نرم دوستانہ انداز میں اس سے بات کر رہا تھا۔

"پریذیڈنٹ ہمیشہ سے تم سے بہت زیادہ توقعات رکھتے تھے۔ افریقہ کے لیے جو وژن ان کا ہے' اسے جو عملی جامہ پہنا سکتا ہے' وہ صرف تم ہو اور یہ پروجیکٹ تو ان سینکڑوں پروجیکٹس میں سے صرف ایک پروجیکٹ ہے' بہت چھوٹا پروجیکٹ۔۔۔ جو وہ تمہارے لیے سوچتے ہیں' وہ بہت بڑی شے ہے۔ تمہارے ذریعے افریقہ کی تقدیر بدلی جا سکتی ہے اور میں تمہیں یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ پریذیڈنٹ افریقہ کے بارے میں بہت سنجیدہ ہیں۔ وہ مخلص ہیں اور وہاں سے بھوک' غربت اور بیماری کو واقعی مٹانا چاہتے ہیں۔ پیٹرس ایباکا ایک بے وقوف آدمی ہے' وہ کچھ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے' جو افریقہ کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ہیں۔"

سالار کو گفتگو میں پیٹرس ایباکا کا حوالہ سن کر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ واشنگٹن میں بیٹھے لوگ مکمل طور پر اس بات سے باخبر تھے کہ اس کی ماہیئت قلب کے پیچھے کون تھا۔

"تم نے کوئی سوال نہیں کیا؟" رافیل کو اچانک اس کی خاموشی چبھی۔ اگر وہ سالار کو اس کے بارے میں' پریذیڈنٹ کے تعریفی کلمات پہنچا کر اسے جوش دلانا چاہتا تھا تو وہ ناکام ہو رہا تھا۔ سالار کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"میرے پاس جو بھی سوال تھے وہ میں اپنی رپورٹ میں اٹھا چکا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ پریذیڈنٹ افریقہ میں میرے کام اور اس رپورٹ سے متاثر ہیں' لیکن میں زیادہ خوش تب ہوں گا جب اس رپورٹ پر مجھے ورلڈ بینک کا کوئی پازیٹو ریسپانس آئے۔"

"بینک تمہیں وائس پریذیڈنٹ کا عہدہ دینا چاہتا ہے اور یہ پریذیڈنٹ کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اس مہینے کے آخر تک' دو وائس پریذیڈنٹس اپنی Tenure (مدت ملازمت) پوری کر کے اپنے عہدوں سے الگ ہو رہے ہیں اور ان میں سے ایک سیٹ پر تمہیں اپائنٹ کرنا چاہتے ہیں وہ۔ اور اس سلسلے میں امریکن گورنمنٹ سے بھی بات ہوئی ہے ان کی۔۔۔ وہاں سے بھی ریسپانس بہت پوزیٹو ہے۔۔۔ تم یقیناً "ڈیزرو" کرتے ہو کہ تمہیں تمہاری صلاحیت اور قابلیت کے حساب سے عہدہ دیا جائے۔"

رافیل اس طرح بات کر رہا تھا جیسے بہت بڑا راز اس پر افشا کر رہا ہو۔ ایسا راز جس کو جاننے کے بعد سالار سکندر کی باچھیں کھل جاتیں۔۔۔ اس کی مایوسی کی انتہا نہیں رہی تھی جب اس نے میز کے دوسری طرف بیٹھے اپنے سے پندرہ سال چھوٹے اس سینتیس سالہ مرد کے چہرے کو اس خبر پر بھی بے تاثر پایا تھا۔

"اور وائس پریذیڈنٹ کے عہدے کے بدلے میں مجھے کیا کرنا ہے؟" رافیل کو اپنی اتنی لمبی تقریر کے جواب میں

اتنا ڈائریکٹ اور دو ٹوک سوال سننے کی توقع نہیں تھی۔

"پریذیڈنٹ کو اس پروجیکٹ پر تمہاری سپورٹ چاہیے۔ مطلق اور غیر مشروط سپورٹ۔"

رافیل نے اب لفاظی اور تمہیدوں میں وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا۔ سالار سکندر کے لیے یہ دونوں چیزیں بے کار اور بے اثر تھیں۔

"میرا خیال ہے میں وہ نہیں دے سکوں گا۔ اس پروجیکٹ کے حوالے سے میری جو رائے اور اسٹینڈ ہے' وہ میں بتا چکا ہوں۔ مراعات اور عہدے میرے اسٹینڈ کو بدل نہیں سکتے۔ میری خواہش ہے افریقہ کے لیے پریذیڈنٹ اگر اتنی ہمدردی اور اخلاص رکھتے ہیں تو وہ اس رپورٹ سے صرف متاثر نہ ہوں' وہ فوری طور پر اس پر کوئی ایکشن لیں۔ کیا کچھ اور ہے' جو آپ کو کہنا ہے؟"

سالار نے کافی کے اس کپ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا جو اس کے سامنے پڑا تھا۔ الیگزینڈر رافیل دنیا کی بہت بڑی بڑی آرگنائزیشنز میں ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ سالار سکندر کو وہ اس ملاقات سے پہلے کچھ بھی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اب اسے بے وقوف سمجھتا تھا۔ سینتیس سال کی عمر میں۔۔۔ پلیٹ میں رکھ کر اسے اتنا بڑا عہدہ پیش کیا جا رہا تھا اور وہ اسے ٹھکرا رہا تھا۔۔۔ غرور تھا۔۔۔ تو بے جا تھا۔۔۔ بے وقوفی تھی تو انتہا کی اور تنگ تھی تو بے مقصد۔۔۔ صدارت پیش کی اس نے اپنی پوری زندگی میں کسی "ذہین" آدمی کو اتنا "بے وقوف" اور "بے غرض" نہیں پایا تھا۔ وہ یہ اعتراف نہیں کرنا چاہتا تھا پر کر رہا تھا۔ وہ پہلی بار ذہانت کو بے لوث اور بے غرض دیکھ رہا تھا اور وہ جانتا تھا وہ جس دنیا میں کام کر رہا تھا' وہاں اس بے غرض اور بے لوث ذہانت کو عروج کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ وہاں بیٹھے اس نے سالار سکندر سے کہا تھا۔

"تمہیں سب کچھ آتا ہے۔ ٹیکٹ نہیں آتے اس لیے تم کامیابی کے سب سے اوپر والے زینے پر کبھی کھڑے نہیں ہو سکو گے۔" وہ اس سے ایسی بات نہیں کہنا چاہتا تھا' پھر بھی کہہ بیٹھا تھا۔

"اگر ٹیکٹ فل ہونے کا مطلب بے ضمیر اور بد دیانت ہونا ہے تو پھر یہ خصوصیت میں کبھی اپنے اندر پیدا نہیں کرنا چاہوں گا۔ میں اپنا استعفیٰ آج ہی میل کر دوں گا۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے آخری مصافحے کے لیے الیگزینڈر رافیل کی طرف ٹیبل پر کچھ جھک کر ہاتھ بڑھایا تھا۔ رافیل اٹھنا نہیں چاہتا تھا لیکن اسے اٹھنا پڑا تھا۔ وہ مصافحہ کر کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے سالار سکندر کی پشت کو دیکھتا رہا اور کیوں دیکھتا رہا تھا۔ وہ یہ نہیں جان پایا تھا۔

☼ ☼ ☼

سالار سکندر جب ورلڈ بینک ہیڈ کوارٹرز سے نکلا اس وقت بوندا باندی ہو رہی تھی' وہ کیب پر وہاں آیا تھا اور واپسی پر بھی اس کو کیب میں ہی واپس جانا تھا مگر جو کچھ وہ پچھلے چند گھنٹوں میں اندر بھگت آیا تھا۔ اس کے بعد وہ بے مقصد ہیڈ کوارٹرز سے باہر آ کر پیدل فٹ پاتھ پر چلتا رہا۔ اس کا ہوٹل وہاں سے قریب تھا۔ وہ پیدل چلتا رہتا تو آدھ پون گھنٹے میں وہاں پہنچ جاتا۔ وہاں آتے ہوئے اسے جلدی تھی۔ واپس جاتے ہوئے نہیں۔ بوندا باندی کی وجہ سے سردی بڑھ گئی تھی مگر وہ اپنے سوٹ کے اوپر لانگ کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ گو میپ سے چلتے ہوئے واشنگٹن کی اگلے تین دن کی موسم کی پیش گوئی پڑھ کر چلا تھا۔ اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ امریکا میں گزارنے کی وجہ سے' وہ جیسے عادی ہو گیا تھا۔ ایک تلی بندھی اور میکانکی انداز میں زندگی گزارنے کا' جہاں ہر چیز پہلے سے دیکھ کر کی جاتی ہے۔ موسم کا حال دیکھ کر سفر پلان کیا جاتا ہے۔ بکنگ کروا کر کسی ہوٹل کے لیے روانہ ہوا جاتا ہے۔ ہر چیز کے بارے میں

پہلے سے طے کرلیا جاتا ہے۔ اس نے ورلڈ بینک میں اس جاب کا بھی اسی میکانکی اور پروفیشنل انداز میں ادراک کیا تھا' لیکن جو کچھ وہ اب بھگت رہا تھا وہ کبھی اس کے فرشتوں نے بھی نہیں سوچا ہو گا۔

ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول کے بعد وہ اس کی پہلی جاب تھی اور وہ اس جاب سے بہت خوش تھا۔ وہ اب زندگی کو پانچ' دس' پندرہ' بیس سالوں کے تناظر میں دیکھتا تھا' کیونکہ اب اسے اپنے ساتھ ساتھ کچھ اور زندگیوں کی ذمہ داریوں کو بھی اٹھانا تھا اور اب یک دم وہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے سب سے بڑے بحران میں پھنس گیا تھا۔ اس کے ساتھ بیوی اور بچوں کی ذمہ داریاں نہ ہوتیں' تب وہ اس طرح پریشان نہ ہوتا کیونکہ جو بھی نتائج ہوتے' اس کے کسی بھی فیصلے کے' وہ صرف اسے بھگتنے پڑتے۔ کوئی اور اس کے کسی فیصلے سے پہنچنے والے کسی نقصان میں شریک نہ ہوتا... لیکن اب...

فٹ پاتھ پر چلتے چلتے اس نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔ وہ چند دن پہلے تک اپنے آپ کو دنیا کا مصروف ترین انسان سمجھتا تھا اور اب ان چند گھنٹوں کے بعد دنیا کا بے کار ترین انسان...

کچھ عجیب سی ذہنی کیفیت تھی اس وقت اس کی... فی الحال اس کے پاس کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی میٹنگ... کوئی وزٹ... کوئی ایجنڈا نہیں... کوئی فون کال کوئی ای میل کوئی پریزنٹیشن بھی نہیں... لیکن سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ ایک لمحے کے لیے چلتے چلتے اسے خیال آیا... کیا ہو اگر وہ سمجھوتا کرلے... وہیں سے واپس ہیڈ کوارٹرز چلا جائے... وہ پیش کش قبول کرلے جو ابھی اسے کی گئی تھی۔ کوئی مشکل اور ناممکن تو نہیں تھا یہ... ابھی سب کچھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ سب کچھ ٹھیک ہو جاتا... زندگی پھر پہلے جیسی ہو جاتی۔ ورلڈ بینک میں پہلے سے بھی زیادہ بڑا عہدہ... ترقی... مراعات... اسٹیٹس... کیا برائی تھی اگر وہ ضمیر کو کچھ دیر کے لیے سلا دیتا... کانگو اس کا ملک نہیں تھا' نہ پگمیز اس کے لوگ... پھر؟

پھر... واقعی ٹھیک کہا تھا رافیل نے' وہ کیوں ان کے لیے یہ سب کر رہا تھا اور یہ سب کرتے کرتے اپنے آپ کو وہاں لے آیا تھا۔ جہاں آگے کنواں تھا پیچھے کھائی... لیکن پھر اسے وہ ساری غربت اور بدحالی یاد آئی تھی جو اس نے ان لوگوں سے ملاقاتوں میں دیکھی تھی... وہ امید بھری نظریں یاد آئی تھیں... جن سے وہ اسے دیکھتے تھے... کاغذات کا وہ پلندہ یاد آیا تھا جس کا ایک ایک لفظ کہتا تھا کہ وہاں جو بھی ہو رہا تھا' وہ انسانیت کی تذلیل تھی۔ وہ غلامی اور غلامانہ استحصال تھا' جو اس کا مذہب چودہ سو سال پہلے ختم کر چکا تھا۔

اور یہ سب یاد کرتے ہوئے اسے امامہ بھی یاد آئی تھی۔

اس نے جیب سے سیل فون نکال کر فٹ پاتھ پر چلتے چلتے اسے کال کی' رابطہ نہیں ہوا۔ اسے لگا شاید سگنلز کا کوئی مسئلہ ہو گا۔ فون اس نے دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔ ایک عجیب سی اداسی اور تنہائی نے اسے گھیرا تھا حالانکہ وہاں فٹ پاتھ پر اس کے آس پاس سے درجنوں لوگ گزر رہے تھے اور برابر میں سڑک پر کئی گاڑیاں چل رہی تھیں... پھر بھی اس نے عجیب سی تنہائی محسوس کی تھی... یہ ویسی ہی تنہائی تھی جو وہ امامہ کی عدم موجودگی میں محسوس کرتا تھا۔

امامہ سے شادی ہونے تک وہ ڈپریشن کے کئی ادوار میں سے گزرا تھا... لیکن ہر بار وہ اس دور سے نکل آتا تھا... وسیم کی موت کے بعد امامہ کی ذہنی حالت نے اسے ایک بار پھر بری طرح انتشار کا شکار کیا تھا' مگر یہ ڈپریشن پہلے جیسا نہیں تھا۔ اس نے کبھی بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اسے لگتا تھا' سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور سب کچھ واقعی ٹھیک ہو گیا تھا اور اب کئی سالوں سے سب کچھ ٹھیک تھا' اب ایک بار پھر سے زندگی عجیب مدوجزر میں آ پھنسی تھی۔

"مجھے لگتا ہے' میری زندگی میں سکون نہیں ہے۔ کچھ دیر کے لیے سب کچھ ٹھیک رہتا ہے' پھر کچھ نہ کچھ غلط ہونے لگتا ہے۔"

اس نے کئی بار امامہ سے یہ سنا تھا اور وہ کبھی اس سے یہ اعتراض نہیں کر سکا تھا کہ یہ صرف اس کی نہیں' خود اس کی اپنی زندگی کا بھی یہی انداز تھا۔۔۔ کہیں نہ کہیں کچھ ٹھیک نہیں رہتا تھا' اس کی زندگی میں بھی۔۔۔ پہلے کی بات اور تھی لیکن امامہ کے مل جانے کے بعد بھی۔۔۔ وہ ویسی زندگی نہیں جی رہا تھا جیسی زندگی وہ امامہ کے ساتھ گزارنے کا خواہش مند تھا یا تصور کرتا تھا۔۔۔ لیکن یہ صرف امامہ کے ساتھ اس کی ازدواجی زندگی ہی نہیں تھی جو نشیب و فراز سے گزرتی رہی تھی۔ اس کی پیشہ ورانہ زندگی میں بھی عجیب و غریب حالات پیدا ہوتے رہتے تھے۔

اس فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ایک لمبے عرصے کے بعد سالار سکندر نے اپنی سینتیس سالہ زندگی کے حاصل محصول پر نظر دوڑائی تھی۔۔۔ نعمتیں یقیناً "بے شمار تھیں۔۔۔ اتنی کہ وہ گننے بیٹھتا تو گنتی بھول جاتا۔۔۔ لیکن بے سکونی بھی جو کسی بلا کی طرح ان کی زندگیوں کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھی۔ وہ بے سکونی کی جڑ تک پہنچنے میں ناکام رہتا تھا۔ وہ حافظ قرآن تھا۔ عملی مسلمان تھا۔ عبادات اور حقوق العباد دونوں میں مثالی۔۔۔ گناہوں سے تائب۔۔۔ نعمتوں سے سرفراز۔۔۔ لیکن سکون دل کو ترستا ہوا۔۔۔ خالی پن کا شکار۔۔۔

سوچوں کی رفتار ایک دم ٹوٹی تھی۔۔۔ وہ حیران ہوا تھا۔۔۔ وہ کس بحران میں کیا سوچنے بیٹھ گیا تھا۔ وہ آزمائش میں پھنسا تھا لیکن وہ اتنی بڑی آزمائش نہیں تھی کہ وہ اپنی پوری زندگی کے حاصل و محصول کو اس بوندا باندی میں' ورلڈ بینک کی عمارت سے اپنے ہوٹل تک کے راستے میں چلتے ہوئے سوچتا۔۔۔ اس کی چھٹی حس اسے جیسے بڑے عجیب انداز میں بے چین کر رہی تھی۔



اس نے اپنی ہر منفی سوچ کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ شاید یہ ذہنی دباؤ کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ اس نے چند لمحوں کے لیے سوچا تھا اور پھر خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر اپنا لیپ ٹاپ والا بیگ رکھتے ہوئے اس نے معمول کے انداز میں ٹی وی آن کیا تھا۔ ایک مقامی چینل پر واشنگٹن میں صبح سویرے ہونے والے ایک ٹریفک حادثے کی خبر چل رہی تھی' جس میں دو مسافر موقع پر مر گئے تھے' جبکہ تیسرا مسافر شدید زخمی حالت میں اسپتال میں تھا۔ لوکل چینل پر تباہ شدہ گاڑی کو جائے وقوع سے ہٹایا جا رہا تھا۔ اپنا لانگ کوٹ اتارتے ہوئے سالار نے ہاتھ میں پکڑے ریموٹ سے چینل بدلنا چاہا' لیکن پھر اسکرین پر چلنے والے ایک ٹکر کو دیکھتے ہوئے وہ جامد ہو گیا۔ اسکرین پر اسکرول میں اس حادثے کے متعلق مزید تفصیلات دی جا رہی تھیں اور اس میں زخمی ہونے والے شخص کا نام پیٹرس ایباکا بتایا جا رہا تھا جو ایک activist (انقلابی) تھا اور سی این این کے کسی پروگرام میں شرکت کے لیے آرہا تھا۔ سالار کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا تھا۔

دنیا میں ہزاروں پیٹرس ایباکا ہو سکتے تھے۔۔۔ لیکن کانگو میں ہگمیز کے لیے کام کرنے والا پیٹرس ایباکا ایک ہی تھا۔ اور سالار یہ بھی جانتا تھا کہ وہ پچھلے کئی دنوں سے امریکا میں تھا۔ وہ امریکا روانہ ہونے سے پہلے اس سے ملنے آیا تھا' اور اس نے سالار کو بتایا تھا کہ اس کے کچھ دوستوں نے بالآخر بڑی کوششوں اور جدوجہد کے بعد کچھ بڑے نیوز چینلز کے نیوز پروگرامز میں اس کی شرکت کے انتظامات کیے تھے اور یہ گارڈین میں شائع ہونے والی رپورٹ کے بعد ممکن ہو سکا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ چھری میری گردن پر گرنے والی ہے۔" سالار نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔ "تم اگر اس پروجیکٹ کے حوالے سے ورلڈ بینک اور اس کے عہدے داران پر تنقید کرو گے تو سب سے پہلے میں ہی

نظروں میں آؤں گا اور یہ چینلز مجھ سے رسپانس لینے کے لیے رابطہ کریں گے۔"
سالار کو اس مشکل صورت حال کا اندازہ ہونے لگا تھا جس میں وہ پیٹرس ایباکا کے انٹرویوز کے بعد پھنستا۔ وہ آتش فشاں جو بہت عرصے سے پک رہا تھا' وہ اب پھٹنے والا تھا اور پھٹنے کے ساتھ ساتھ وہ بہت سوں کو بھی ڈبونے والا تھا۔
"میں تمہیں بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔" ایباکا نے اسے یقین دلایا تھا۔ "میں تم پر کوئی تنقید نہیں کروں گا بلکہ تمہاری سپورٹ کے لیے تمہاری تعریف کروں گا۔ تم تو اب آئے ہو یہ پروجیکٹ تو تمہارے آنے سے پہلے سے جاری ہے۔"
ایباکا بے حد سنجیدہ تھا لیکن سالار کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس کی یہ یقین دہانی ایک خوش فہمی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ سالار سکندر اس پروجیکٹ کی سربراہی کر رہا تھا اور نہ اسے جمعہ جمعہ چار دن ہوئے تھے وہاں آئے.... نہ تو یہ وہ اتنا احمق ہو سکتا تھا کہ کسی پروجیکٹ کی تفصیلات جانے بغیر اسے جوائن کر لیتا۔ اگر وہ اس کا حصہ تھا تو کسی نہ کسی حد تک اسے بھی میڈیا کی شدید تنقید کا سامنا ہونے والا تھا۔ ایباکا کی تعریف ورلڈ بینک کی انتظامیہ کی نظروں میں اس کا امیج خراب کرتی اور اس کی خاموشی دنیا کی نظروں میں....
"تم جلد سے جلد ورلڈ بینک چھوڑ دو۔ میں تمہاری رپورٹ کا حوالہ دوں گا کہ اس پروجیکٹ سے ناخوش تھے اور تمہارے اس پوزیشن کو چھوڑنے کی وجہ بھی یہ ہی ہے۔" ایباکا نے جیسے اسے ایک راہ دکھائی تھی۔
"میں اس سے پہلے ایک کوشش ضرور کروں گا کہ بینک کو مجبور کر سکوں کہ وہ اس پروجیکٹ پر نظرثانی کرے۔"
جو راستہ وہ سالار کے لیے نکال رہا تھا وہ سالار کو بھی پتا تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک آخری کوشش کرنا چاہتا تھا۔ بینک کا ردعمل جاننے کے لیے.... اسے جیسے یہ امید تھی کہ بینک اگر فوری طور پر اس پروجیکٹ کو نہیں روک سکتا تب بھی کوئی انکوائری تو آرڈر کر ہی سکتا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اتنے تفصیلی ثبوتوں کے باوجود بینک آنکھیں بند کرکے "صم" "وبکم" کی طرح بیٹھا رہتا۔
ایباکا نے اس کے ساتھ کوئی بحث نہیں کی تھی۔ وہ ان دونوں کا آخری رابطہ تھا۔ وہ واشنگٹن آنے تک میڈیا پر ایباکا اور کانگو کے بارانی جنگلات کے حوالے سے کوئی نئی خبر تلاش کرتا رہا' لیکن وہ نئی خبر اسے آج ملی تھی۔ نیوز چینل بتا رہا تھا کہ بچنے والے مسافر کی حالت تشویش ناک تھی۔ سالار کچھ دیر شل ہوتے ہوئے اعصاب کے ساتھ کھڑا رہا پھر اس نے اپنا فون نکال کر یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ ایباکا کو کہاں لے جایا گیا تھا۔ عجیب اتفاق تھا' لیکن یک دم جیسے اس کا فون رابطوں کے مسائل کا شکار ہونے لگا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ کانگو میں امامہ سے رابطہ نہیں کر پایا تھا اور اب وہ کوئی لوکل کال نہیں کر پا رہا تھا' کچھ دیر اپنے سیل فون کے ساتھ مصروف رہنے کے بعد ناکامی پر سالار نے جیسے جھنجلا کر کمرے میں موجود فون لائن اٹھا کر اسے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ فون لائن بھی کام نہیں کر رہی تھی۔ سالار حیران ہوا تھا۔ وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل تھا اور اس کی فون لائن کا ڈائریکٹ کام نہ کرنا حیران کن ہی تھا۔ اس نے انٹرکام پر آپریٹر کے ذریعے ایک کال بک کروائی تھی۔
اگلا آدھا گھنٹہ وہ آپریٹر کی کال کا انتظار کرتا رہا۔ وہ پہلا موقع تھا جب سالار کو ایک عجیب سی بے چینی محسوس ہوئی تھی' پہلی بار اسے لگا تھا جیسے اس کو کسی سے بھی رابطہ کرنے سے روکا جا رہا ہے۔ وہ اس شک کو اپنے ذہن سے جھٹک دینا چاہتا تھا۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر وہ اسی بے چینی اور بے قراری کے عالم میں اپنے کمرے سے نکل کر نیچے استقبالیہ پر آگیا تھا۔ اس بار کہیں بھی خود کال کرنے کے بجائے اس نے ریسپشنسٹ سے کہا تھا کہ وہ اسے پولیس انکوائری سے پتا کر کے بتائے کہ آج صبح واشنگٹن میں ہونے والے اس ٹریفک حادثے کے زخمی کو کہاں لے

جایا گیا تھا۔ ریسپشنسٹ نے اسے لابی میں پڑے ایک صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا اور چند ہی منٹوں میں اس نے سالار کو اس اسپتال کا نام بتا دیا تھا جہاں پیٹرس ایباکا کو لے جایا گیا تھا۔ سالار نے اسی ریسپشنسٹ کو کانگو میں اپنے گھر کے اور امامہ کا سیل فون نمبر دیا تھا۔ وہ اگلی کال وہاں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جیسے اپنے خدشات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

کچھ دیر تک کوشش کرتے رہنے کے بعد ریسپشنسٹ نے اسے کہا تھا کہ اس کے گھر کے نمبر یا امامہ کے سیل فون کسی پر کال نہیں ہو پا رہی تھی شاید کانگو اور امریکا کے درمیان اس وقت رابطوں میں گڑبڑ تھی۔ سالار کے خدشات کی لحہ بھر میں ہوا نکل گئی تھی۔ وہ شاید ضرورت سے زیادہ وہم کرنے لگا تھا۔ اس نے اپنا سر جھٹکتے ہوئے سوچا اور ریسپشنسٹ سے اپنے کمرے کی ڈائریکٹ فون لائن کے فنکشنل نہ ہونے کی شکایت کرنے کے بعد وہ وہیں سے اسپتال کے لیے روانہ ہو گیا تھا جہاں پیٹرس داخل تھا۔

اسپتال پہنچ کر پیٹرس کو تلاش کرنا مشکل نہیں تھا' لیکن اسے ایباکا سے ملنے نہیں دیا گیا تھا۔ وہ مخدوش حالت میں تھا اور اس کی سرجری کے بعد اسے مصنوعی تنفس پر رکھا گیا تھا۔ اپنے آپ کو ایباکا کا رشتہ دار ظاہر کرنے پر اسے بہرحال ایباکا کو دور سے ایک نظر دیکھنے کی اجازت مل گئی تھی۔ مگر استقبالیہ پر موجود شخص نے اسے بے یقینی اور شبہ کی نظر سے دیکھا تھا۔ ایک پگمی اور ایک جنوبی ایشیا میں رہنے والے کی رشتہ داری کیسے ممکن تھی بھلا...؟ لیکن اب اگر کوئی اس کا دعوے دار ہو گیا تھا تو وہ کیا کر سکتا تھا۔ ایباکا کی حالت ویسے بھی اتنی نازک تھی کہ وہ کسی بھی وقت مر سکتا تھا۔ اس کا دماغ آہستہ آہستہ کام کرنا چھوڑ رہا تھا اور ریسپشن پر موجود آدمی نے جیسے ایک مرتے ہوئے شخص کے لیے احساس ہمدردی دکھایا تھا۔

اسپتال کے آئی سی یو میں نلکیوں' تاروں اور پٹیوں میں جکڑے ایباکا کو سالار پہلی نظر میں پہچان نہیں سکا تھا۔ وہ سیاہ فام پست قامت آدمی موٹی چمک دار آنکھوں اور ایسی مسکراہٹ کے لیے پہچانا جاتا تھا جو کسی چھوٹی سی بات پر بھی اس کے چہرے پر آجاتی۔ وہ بات بے بات قہقہے لگانے کا بھی عادی تھا اس کے موٹے موٹے سیاہ ہونٹوں سے نظر آنے والے دودھیا دانت اور مسوڑھے اس کے ہر قہقہے میں سب سے پہلے نمایاں ہوتے تھے۔

آئی سی یو کی کھڑکی سے اسے دیکھتے ہوئے سالار کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کرے۔ اس کا اور ایباکا کا انسانیت کے علاوہ کوئی رشتہ نہیں تھا' پھر بھی وہ عجیب غم زدہ حالت میں وہاں کھڑا تھا۔ ایباکا کی مخدوش حالت اس کے علم میں آچکی تھی۔ پگمیز اگر ایباکا کو کھو دیتے تو گونگے ہو جانے والے تھے' کوئی چیز ان کے مقاصد کو اس سے زیادہ نقصان نہ پہنچاتی جتنا ایباکا کی موت پہنچانے والی تھی۔ سالار گم صم کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ صرف پگمیز کا نہیں کانگو کا صدر بننا چاہتا تھا۔ ہاورڈ بزنس اسکول اور جان ایف کینیڈی اسکول آف گورنمنٹ سے فارغ التحصیل ہونے والے ممتاز ترین افراد میں سے ایک پیٹرس ایباکا بھی ہوتا' اگر زندگی اسے ایک موقع دیتی... شاید وہ کبھی نہ کبھی کانگو کا صدر بن جاتا اور افریقہ کے نمایاں ترین لیڈرز میں اس کا شمار ہوتا... لیکن زندگی فی الحال اسے یہ موقع نہیں دے رہی تھی۔

وہاں کھڑے کھڑے سالار کو ایک بار پھر جیسے خیال آیا تھا کہ وہ چاہتا تو اب بھی یہ سب ٹھیک کر سکتا تھا۔ ایباکا مر رہا تھا اور اس کے مرنے کے ساتھ ہی وہ سارے حقائق اور شواہد بھی غائب ہو جانے والے تھے۔ پگمیز کو فوری طور پر ایباکا کا متبادل نہیں مل سکتا تھا' جو امریکا میں کسی نہ کسی حد تک رسوخ رکھتا ہو۔ ایباکا کے ساتھ جو دوسرے لیڈرز تھے وہ سب مقامی تھے۔ زیادہ تر ان پڑھ... انہیں صرف جنگل میں لڑنا آتا تھا یا اپنی بقا کے لیے شکار کرنا... کانگو سے باہر کی دنیا میں اپنا کیس پیش کرنے کے لیے ان کے پاس باقی چیزیں اور زبان تو ایک طرف اعتماد تک نہیں

تھا جس کے ساتھ وہ سی پی آنکھ میں آنکھ ڈال کر اپنے حق کی بات اس ڈھنگ انداز میں کہہ سکیں، جس طرح ایبا کا کہتا تھا۔ شاید یہ ایک موقع اسے قدرت دے رہی تھی۔ وہ الجھا، بھٹکا Temnpt ہوا۔ ضمیر کا چابک ایک بار پھر اس پر برسا تھا اور ضمیر کا چابک واحد چیز نہیں تھی جس نے سالار کو جھٹکا دیا تھا۔ اس کی اپنے ہوٹل واپسی پر ایک اور بڑا سانحہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے کمرے میں اس کا لاکر کھلا ہوا تھا اور اس لاکر میں موجود اس کا پاسپورٹ، اور کچھ دوسرے اہم ڈاکومنٹس غائب تھے، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس کا وہ بیگ بھی غائب تھا جس میں اس کا لیپ ٹاپ اور اس رپورٹ سے متعلقہ تمام ثبوتوں کی کاپیاں تھیں۔ سالار کو چند لمحوں کے لیے یقین نہیں آیا، اسے لگا وہ اس کا کمرہ نہیں ہوگا۔ وہ شاید غلطی سے کسی اور کمرے میں داخل ہوگیا تھا۔ یہ حماقت کی انتہا تھی۔ لیکن اس نے جیسے اپنے کمرے سے نکل کر دروازے پر نمبر پڑھا تھا۔ وہ اسی کا کمرہ تھا۔ جو اس باختگی کے عالم میں وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے پاگلوں کی طرح کمرے کے ایک ایک کونے کھدرے کو چھان مارا، صرف اس موہوم امید میں کہ شاید وہ جس ذہنی کیفیت سے گزر رہا تھا، اس میں اس نے خود ہی ان سب چیزوں کو کہیں اور رکھ دیا تھا۔ کمرے میں کہیں کچھ نہیں تھا۔ وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل تھا اور اگرچہ ہوٹل کے کمرے میں رکھی جانے والی کسی بھی قسم کی قیمتی اشیا کے لیے لاکر فراہم کرنے کے ساتھ ہی وہ ہر طرح کی ذمہ داری سے بری الذمہ ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود سالار کو یقین نہیں آیا کہ وہ سب ہو چکا تھا۔ کوئی اس کے کمرے سے اس کے ٹریول ڈاکومنٹس اور لیپ ٹاپ کیوں لے کر جاتا اور اس سے بھی بڑا سوال تھا کہ کون لے کر گیا تھا۔

بے حد تشویش کے عالم میں اس نے فون اٹھا کر فوری طور پر اپنے ساتھ ہونے والے واقعے کی اطلاع مینجر کو دیتے ہوئے اسے کمرے میں طلب کیا تھا۔ اسے اس وقت بھی یقین تھا کہ کوریڈور میں لگے سی سی ٹی وی فوٹیج کی مدد سے بڑے آرام سے اس کی عدم موجودگی میں اس کے کمرے میں داخل ہونے والے کسی بھی شخص کا پتا چل جائے گا، لیکن مینجر اور سیکورٹی گارڈز کے اس کے کمرے میں آتے ہی سالار کا دماغ یہ جان کر بھک سے اڑ گیا تھا کہ اس پورے فلور پر صفائی سے متعلقہ کام کرنے کے لیے پچھلے دو گھنٹے اس فلور کے سی سی ٹی وی کیمرے آف کیے گئے تھے۔ یہ ناقابل یقین بات تھی۔ اسے لگا تھا ایک دم جیسے اس کے ہاتھ پاؤں کٹ گئے تھے۔ اس کے پاس، جو بھی تھا وہ اس لیپ ٹاپ اور اس کے بیگ میں تھا۔ ان کے غائب ہونے کا مطلب تھا کہ وہ بالکل بے دست و پا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی رپورٹ کے کسی الزام اور تحقیق کو ڈاکومنٹری ثبوت کے بغیر ثابت نہیں کر سکتا تھا اور ان دستاویزاتی ثبوتوں کی ایک کاپی اس کے پاس تھی اور ایک کاپی کومبے میں اس کے گھر کے اس لاکر میں، جو وہ امامہ کی تحویل میں دے کر آیا تھا۔

وہ پہلا موقع تھا جب سالار نے ایک عجیب سا خوف محسوس کیا تھا۔ ہر چیز کو اتفاق سمجھتے ہوئے وہ پہلی بار ان سب واقعات کو ایک دوسرے سے جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ بڑے آرام سے جڑتے جا رہے تھے۔ وہ وہمی نہیں تھا، نہ ہی سازشی نظریوں پر یقین رکھتا تھا، لیکن جو کچھ اس ایک دن میں ہوا تھا، وہ اتفاق نہیں ہو سکتا تھا۔

پیٹرس ایباکا کا ایک حادثہ میں زخمی ہونا بھی اب اسے ایک اتفاق نہیں لگ رہا تھا۔ کوئی تھا جو پیٹرس ایباکا کو نقصان پہنچانے کے بعد اب اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اسے بے بس کر رہا تھا۔ پہلا خیال جو اسے وہاں کھڑے کھڑے آیا تھا۔ وہ امامہ اور اپنے بچوں کے تحفظ کا تھا۔ ضروری تھا کہ وہ ان سے رابطہ کرتا اور ہر قیمت پر کرتا۔ اسے یقین تھا، اس ہوٹل کے اندر وہ کبھی بھی کانگو میں امامہ سے رابطہ نہیں کر سکتا تھا، لیکن اسے امامہ کو متنبہ کرنا تھا، اس سے کہنا تھا کہ وہ ان ڈاکومنٹس کے ساتھ پاکستان ایمبیسی یا کسی پولیس اسٹیشن چلی جائے، کم از کم تب تک جب تک وہ خود وہاں نہیں پہنچ جاتا۔

اس نے مینجر سے کہا تھا کہ وہ پولیس میں رپورٹ کروانا چاہتا تھا۔ اس کی قیمتی چیزوں کی حفاظت یقیناً "ہوٹل کی ذمہ داری نہیں تھی "لیکن ہوٹل کم از کم اتنی ذمہ داری ضرور دکھاتا کہ اس کی عدم موجودگی میں اس فلور کے سی سی ٹی وی سسٹم کو صفائی کے لیے آف نہ کیا جاتا۔

مینجر نے معذرت کرتے ہوئے فوری طور پر اسے اس کے نقصان کی تلافی کی آفر کی تھی اور اس سے درخواست کی تھی کہ وہ پولیس کو اس معاملے میں انوالو نہ کرے 'لیکن سالار اس وقت اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ وہ اپنے کمرے سے ہی باہر نہیں نکلا تھا' وہ اس ہوٹل سے بھی باہر نکل آیا تھا۔

ایک فون بوتھ سے اس نے ایک بار پھر کانگو میں اپنے گھر کے نمبرز اور امامہ کا نمبر ملانے کی کوشش کی تھی۔ نتیجہ وہی آیا تھا' اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے فون پر ای میلز سوشل میسیجنگ کے ذریعے بھی امامہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن کسی ای میل ہ کسی میسیج کا جواب نہیں آیا تھا۔ سالار نے باری باری پاگلوں کی طرح اپنے آفس کے ہر شخص کو کال کرنی شروع کردی تھی جو اس کے اسٹاف میں شامل تھا اور جن کے نمبرز اس وقت اس کے پاس تھے۔ کوئی ایک نمبر ایسا نہیں تھا جس پر رابطہ ہو پاتا۔

اس نے بالآخر پاکستان میں سکندر عثمان کو فون کیا تھا اور جب اسے فون پر ان کی آواز سنائی دی تو کچھ دیر کے لیے تو اسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ وہ بالآخر کسی سے بات کرنے میں کامیاب ہو پا رہا تھا۔ سکندر عثمان کو بھی اس کی آواز سے پتا چل گیا تھا کہ وہ پریشان تھا۔

سالار نے کوئی تفصیلات بتائے بغیر مختصراً" انہیں بتایا کہ "وہ اپنی سفری دستاویزات گنوا بیٹھا ہے اور اس وجہ سے وہ فوری طور پر اگلی فلائٹ پکڑ کر واپس نہیں جاسکتا تھا اور وہ امامہ سے رابطہ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے سکندر سے کہا کہ وہ پاکستان سے امامہ کو کال کریں اور اگر اس سے رابطہ نہ ہو سکے تو پھر فارن آفس میں اپنے جاننے والوں کے ذریعے کنشاسا میں پاکستان ایمبیسی کے ذریعے اسے تلاش کریں اور فوری طور پر اس سے کہیں کہ وہ لاکر میں پڑے سارے ڈاکومنٹس سمیت ایمبیسی چلی جائے۔" سکندر عثمان بری طرح کھٹکے تھے۔

"ایسا کیا ہوا ہے کہ تمہیں یہ سب کچھ کرنا پڑ رہا ہے؟ سالار سب کچھ ٹھیک ہے نا؟"

"پاپا! اس وقت آپ صرف وہ کریں جو میں کہہ رہا ہوں۔ میں ڈیٹیلز آپ کو بعد میں بتادوں گا۔" وہ جھنجلا گیا تھا۔

"میں تھوڑی دیر تک آپ کو خود کال کرکے پوچھتا ہوں' آپ میرے فون پر کال مت کریں' نہ ہی میرے نمبر پر میرے لیے کوئی میسیج چھوڑیں۔" اس نے باپ کو مزید تاکید کی۔

"سالار! تم مجھے پریشان کر رہے ہو۔" سکندر عثمان کا ان ہدایات کے بعد خوف زدہ ہونا لازمی تھا۔

سالار نے فون بند کردیا تھا۔ وہ باپ کو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کے اپنے حواس ان سے زیادہ خراب ہو رہے تھے۔ فون بوتھ سے کچھ فاصلے پر پڑی ایک بینچ پر بیٹھتے ہوئے اس نے بے اختیار خود کو ملامت کی تھی۔ اسے اپنی فیملی کو کانگو میں چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا اور ان حالات میں۔۔۔ میٹنگ جاتی بھاڑ میں۔۔۔ وہ اسے آگے پیچھے کروا دیتا۔۔۔ کیا ضرورت تھی اتنی مستعدی دکھانے کی۔۔۔

اب رات ہو رہی تھی اور صبح سے لے کر اس وقت تک اس کے فون پر کوئی کال 'کوئی ٹیکسٹ میسیج نہیں آیا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا تب تک جب تک اس کے فون کو مانیٹر نہ کیا جا رہا ہو یا اس کے سگنلز کو کنٹرول نہ کیا جا رہا ہوتا۔ فون سگنلز کو بہترین حالت میں دکھا رہا تھا مگر سالار کو یقین تھا اس کا فون اور فون کے ذریعے ہوئے اس کے رابطوں کو کنٹرول کیا جا رہا تھا اور کس لیے۔۔۔؟ یہ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

وہ اگر اسے نقصان پہنچانا چاہتے تھے تو ان سب ہتھکنڈوں کے بغیر نقصان پہنچاتے' جیسے پیٹرس پر وار کیا گیا تھا اور انہیں اگر اسے بینک سے نکالنا تھا تو وہ یہ کام تو خود ہی کر رہا تھا' پھر یہ سب کیوں کیا جا رہا تھا۔

اس کی ریڑھ کی ہڈی میں جیسے کوئی سنسناہٹ ہوئی تھی۔ اسے اچانک احساس ہوا وہ لوگ اسے یہ احساس ہی دلانا چاہتے تھے کہ اسے مانیٹر کیا جا رہا تھا۔ اسے نقصان پہنچایا جا سکتا تھا۔۔۔ اور کس کس قسم کا۔۔۔ اسے یہ بھی بتایا جا رہا تھا اور یہ سب ورلڈ بینک نہیں کر سکتا تھا صرف ورلڈ بینک نہیں۔۔۔ اسے سی آئی اے چیک کر رہی تھی۔ پتا نہیں جو پسینے چھوٹے تھے' وہ جسم کے ٹھنڈا ہونے پر چھوٹے تھے یا گرم ہونے پر۔۔۔ لیکن سالار کچھ دیر کے لیے پانی میں نہا گیا تھا۔ اس کا دماغ اس وقت بالکل خالی ہو گیا تھا۔ یہ کبھی اس کے فرشتوں نے بھی نہیں سوچا ہوگا کہ وہ کبھی کسی ایسے معاملے میں انوالو ہو سکتا تھا کہ سی آئی اے اس کے پیچھے پڑ جاتی اور اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پروجیکٹ ورلڈ بینک کی خواہش نہیں امریکا کی خواہش تھا اور وہ اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔

وہ ڈیڑھ گھنٹہ وہیں بت کی طرح بیٹھا رہا تھا۔ اسے تین دن کے لیے واشنگٹن میں رہنا تھا اور تیسرے دن واپس چلا جانا تھا' لیکن اب اپنی ٹریول ڈاکومنٹس گم ہو جانے کے بعد اسے یقین تھا' وہ فوری طور پر واپس نہیں جا سکتا تھا۔ کم از کم تب تک جب تک وہ ان مطالبات پر کچھ لچک نہ دکھاتا جو وہ لوگ اس سے کر رہے تھے۔

ڈیڑھ گھنٹے کے بعد سکندر عثمان کو اس نے دوبارہ فون کیا تھا اور انہوں نے اسے بتایا کہ امامہ اور اس کے بچے گھر پر نہیں ہیں۔ گھر لاکڈ ہے اور وہاں کوئی ملازم یا گارڈ نہیں ہے جو ان کے بارے میں کوئی اطلاع دیتا۔ ایمبیسی کے افسران نے کانگو کی وزارت داخلہ کے ساتھ اس سلسلے میں رابطہ کیا تھا' مگر اس کی فیملی کے بارے میں جو بھی پتا چلتا' وہ فوراً "پتا نہیں چل سکتا تھا۔ کچھ وقت تو لگتا ہے۔"

جو کچھ وہ فون پر سن رہا تھا' اس کے جسم میں کپکپاہٹ دوڑانے کے لیے کافی تھا۔ امامہ اور اس کے بچے کہیں نہ جا سکتے تھے۔ اس سے پوچھے اور اسے اطلاع دیے بغیر۔۔۔ گارڈز بینک کے فراہم کیے ہوئے تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ گھر لاکڈ ہونے پر وہ بھی وہاں سے چلے گئے۔

"میں کوشش کر رہا ہوں' فوری طور پر ایمبیسی میرے ویزے کا انتظام کرے اور میں وہاں جا کر خود اس سارے معاملے کو دیکھوں۔"

سکندر عثمان اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

"تم بھی کوشش کرو کہ فوری طور پر وہاں پہنچو۔ امریکن ایمبیسی کو ان کی گمشدگی کی اطلاع دو۔۔۔ تم تو امریکن نیشنل ہو۔۔۔ تمہارے بچے بھی۔۔۔ وہ ہماری ایمبیسی سے زیادہ مستعدی سے انہیں تلاش کر لیں گے۔"

سکندر عثمان نے اسے ایک راستہ دکھایا تھا اور بالکل ٹھیک دکھایا تھا' لیکن وہ باپ کو اس وقت یہ نہیں کہہ پایا تھا کہ وہ اس وقت امریکن گورنمنٹ کے ساتھ ہی الجھ پڑا تھا۔

"سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا سالار! تم پریشان مت ہو۔ کانگو میں ابھی اتنا بھی اندھیر نہیں مچا کہ تمہاری فیملی اس طرح غائب ہو جائے۔"

سکندر عثمان اگر کانگو میں رہ چکے ہوتے تو شاید کبھی یہ جملہ نہ کہتے۔ وہ شاید یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کا بیٹا جو امریکن نیشنل اور ورلڈ بینک سے منسلک تھا اس کے یا اس کی فیملی کے ساتھ کچھ بھی غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ جواب میں کہنے کے لیے سالار کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔۔۔ کچھ بھی۔۔۔

آج وہ محاورتاً نہیں حقیقتاً "گونگا ہوا تھا اور جب کچھ بول نہیں پا رہا تھا تو اس کا دل چاہ رہا تھا' وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر بے ہنگم انداز میں چلائے۔۔۔ سکندر عثمان سے مزید کچھ بھی کہے بغیر وہ فون رکھ کر فون بوتھ سے آ گیا تھا۔ اس فون

بوتھ سے واپس ہوٹل میں جانے میں اسے صرف پانچ منٹ لگے تھے، لیکن اس وقت وہ پانچ منٹ سالار کو پانچ ہزار سال لگ رہے تھے۔ وہ ملک اور وہ شہر اس کے دوستوں اور رشتہ داروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک فون کال کرتا اور وہاں مجمع لگا لیتا۔ لیکن کوئی مجمع کوئی اس کا مسئلہ، اس کی آزمائش ختم نہیں کر سکتا تھا اور آزمائش تھی کہ بلا کی طرح اس کے سر پر آئی تھی، اس سے بھی بڑھ کر اس کی فیملی کے سر پر....

وہ ہوٹل کے کمرے میں آ کر دروازہ بند کر کے خود پر قابو نہیں رکھ پایا تھا۔ وہ بے اختیار چیخیں مارتا رہا تھا۔ اس ہوٹل کے ساتویں فلور کے ایک ڈبل گلیزڈ شیشوں والے ساؤنڈ پروف کمرے کے دروازے کو اندر سے لاک کیے وہ اس کے ساتھ چپکا پاگلوں کی طرح چلاتا رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جب کئی سال پہلے مارگلہ کی پہاڑیوں پر ایک تاریک رات میں ایک درخت سے بندھا چلاتا رہا تھا۔ بے بسی کی وہی انتہا اس نے آج بھی محسوس کی تھی اور اس سے زیادہ شدت سے محسوس کی تھی۔ تب جو بھی گزر رہا تھا۔ اس کے اپنے اوپر گزر رہا تھا۔ جو بھی ہونا تھا صرف اسے ہونا تھا۔

آج جو بھی گزر رہا تھا، وہ اس کی بیوی اور کم سن بچوں پر گزر رہا تھا اور ان کو پہنچنے والی کسی تکلیف کا تصور بھی سالار سکندر کو جیسے صلیب پر لٹکا رہا تھا۔ اگر کوئی غلطی تھی تو اس کی تھی، اس کی فیملی کا کیا قصور تھا.... وہ اسے مار دیتے، پیٹرس ایباکا کی طرح۔۔۔ اسے یہ بھی قبول تھا کہ وہ ایباکا کی طرح اس بستر پر اسی حالت میں پڑا ہوتا، لیکن امامہ، جبریل اور عنایہ اور وہ اس کا وہ بچہ جو ابھی دنیا میں آیا بھی نہیں تھا، ان کا کیا قصور تھا۔

وہ لوگ جو اس کے اعصاب کو شل کرنا چاہتے تھے، وہ اس میں کامیاب ہو رہے تھے۔ وہ اگر اسے گھٹنوں کے بل گرانا چاہتے تھے تو وہ گر گیا تھا۔ وہ اسے اوندھے منہ دیکھنا چاہتے تھے تو وہ اوندھے منہ پڑا تھا۔

وہ رات سالار پر بہت بھاری تھی۔ پتا نہیں وہ کتنی بار ہوٹل سے نکل کر فون بوتھ پر گیا تھا۔ سکندر عثمان کو فون کر کے وہ امامہ اور اپنے بچوں کے بارے میں کسی اطلاع کا پوچھتا اور پھر اسی طرح واپس آ جاتا۔ وہ ساری رات ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سو پایا تھا۔ امامہ، جبریل اور عنایہ کے چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتے رہے تھے۔

اگلی صبح وہ آفس کے اوقات کے شروع ہونے سے بہت دیر پہلے ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا تھا۔

الیگزینڈر رافیل نے اپنے کمرے میں آتے ہوئے سالار سکندر کو بڑے اطمینان سے دیکھا تھا۔ یہ وہ سالار نہیں تھا جو کل یہاں آیا تھا۔ ایک دن اور ایک رات نے اسے جیسے پہاڑ سے مٹی کر دیا تھا۔

"مجھے پریذیڈنٹ سے ملنا ہے۔"

اس نے آتے ہی جو جملہ کہا تھا، رافیل اس سے اس جملے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا، وہ اس سے کہے گا کہ وہ ان کی تمام شرائط ماننے کے لیے تیار تھا، لیکن وہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔

"پریذیڈنٹ سے ملاقات.... بہت مشکل ہے یہ تو.... کم از کم اس مہینے میں تو یہ ممکن نہیں ہے.... اور پھر اس ملاقات کی ضرورت کیوں پیش آئی تمہیں....؟ اگر تمہیں وہ سب کچھ دہرانا ہے جو تم کل یہاں کہہ کر گئے تھے تو وہ میں پریذیڈنٹ تک پہنچا چکا ہوں۔"

رافیل آج اس ٹون میں بات کر رہا تھا جس ٹون میں وہ کل بورڈ روم میں بیٹھا بات کرتا رہا تھا۔ کچھ لمحوں کے لیے سالار کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ وہ ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹر میں بیٹھ کر رونا نہیں چاہتا تھا، لیکن اس وقت اسے لگ رہا تھا، وہ کسی بھی لمحے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے گا اور آخری چیز جو وہ کرنا چاہتا تھا، یہی ایک کام تھا۔

"کنشاسا میں کل سے میری فیملی غائب ہے.... میری بیوی.... میرا بیٹا.... میری بیٹی...." اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے اس نے رافیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"اوہ۔۔۔ بہت افسوس ہوا۔۔۔ تمہیں فوری طور پر واپس جانا چاہیے کانگو' تاکہ پولیس کی مدد سے اپنی فیملی کو برآمد کرواسکو۔۔۔ جو حالات کانگو میں ہیں ان میں کوئی گمشدہ شخص بہت کم ہی صحیح سلامت ملتا ہے' لیکن پھر بھی۔۔۔"

رافیل یوں بات کر رہا تھا جیسے اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کے لہجے' چہرے' آنکھوں میں کہیں سالار کے انکشاف پر افسوس یا ہمدردی نہیں تھی۔ سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میرا پاسپورٹ اور سارے ڈاکومنٹس گم ہو چکے ہیں۔ ہوٹل کے کمرے سے سب کچھ غائب ہوا ہے کل۔۔۔ اور اب میں کل واپس کنشاسا نہیں جا سکتا۔ مجھے ہیڈ کوارٹر کی مدد چاہیے اپنے پاسپورٹ اور دوسری دستاویزات کے لیے۔۔۔ اور مجھے ورلڈ بینک سے فوری طور پر ڈاکومنٹس چاہئیں' تاکہ میں اپنا پاسپورٹ لے سکوں۔"

رافیل نے اس کی بات خاموشی سے سننے کے بعد اسے بڑے ہی ٹھنڈے انداز میں سرد مہری سے کہا۔

"ان حالات میں ورلڈ بینک تمہیں نئے پاسپورٹ کے لیے کوئی لیٹرز جاری نہیں کر سکے گا' کیونکہ تم آج ریزائن کر رہے ہو۔۔۔ میرا خیال ہے' تمہیں معمول کے طریقہ کار کے مطابق پاسپورٹ کے لیے اپلائی کرنا چاہیے اور پھر کانگو جانا چاہیے ایک وزیٹر کے طور پر۔۔۔ اگر تم ورلڈ بینک کے ایمپلائی ہوتے تو ہم تمہاری فیملی کے لیے کسی بھی حد تک جاتے' لیکن اب وہ اور ان کا تحفظ ہماری آرگنائزیشن کی ذمہ داری نہیں۔۔۔ تمہارے لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ تم کنشاسا میں امریکن ایمبیسی سے رابطہ کرو اور اپنی فیملی کے لیے مدد مانگو یا پھر پاکستانی ایمبیسی سے۔۔۔ تم اوریجنلی پاکستان سے ہی ہو نا؟"

رافیل نے اپنی گفتگو کے اختتام پر بڑے بھول پن سے اس سے یوں پوچھا جیسے اسے یہ اچانک یاد آیا ہو کہ وہ دہری شہریت رکھتا تھا۔

سالار اس کے اس تضحیک آمیز جملے کو شہد کے گھونٹ کی طرح پی گیا۔ ورلڈ بینک کے ایمپلائی کو بلو پاسپورٹ ایشو ہوتا تھا اور اس پاسپورٹ کے حصول کے لیے اسے ایک بار پھر سے ہیڈ کوارٹر سے اس کے لیے لیٹر چاہیے تھا یا پھر ورلڈ بینک اس کی جگہ پر خود اس پاسپورٹ کے لیے اپلائی کرکے اسے پاسپورٹ دلواتا۔۔۔ لیکن اب رافیل کے دوٹوک انکار نے سالار کے ذہنی ہیجان میں اضافہ کر دیا تھا۔ زندگی میں کبھی کسی مغربی ادارے سے اسے اتنی شدید نفرت محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی اس دن ورلڈ بینک ہیڈ کوارٹر میں بیٹھے ہوئے ہوئی تھی۔

وہ اپنی زندگی کے بہترین سال اور بہترین صلاحیتیں مغرب کو دیتا آیا تھا۔۔۔ اقوام متحدہ کے باقی ادارے اور اب ورلڈ بینک۔۔۔ وہ اس ہیڈ کوارٹر میں کل تک ایک خاص اسٹیٹس کے ساتھ آتا رہا تھا اور آج وہ اس سے اس طرح برتاؤ کر رہے تھے جیسے وہ ایک بھکاری تھا۔ ایک ناکارہ' بے کار آدمی۔۔۔ جس کے پاس اب ورلڈ بینک کو دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ انہیں اس کی اتنی ہی دیانت داری' اخلاص اور ضمیر چاہیے تھا جو صرف ان کے ادارے اور تہذیب کی ترقی کے لیے ضروری تھا۔ انسانیت' مادہ پرستی کے اس جنگل کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی جسے مغرب ترقی کہتا تھا اور اسی ترقی کے حصول کی خواہش میں وہ بھی ساری عمر سرگرداں رہا تھا۔

بعض لمحے انسانوں کی زندگی میں تبدیلی کے لمحے ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی تبدیلیوں کے۔۔۔ صرف ایک لمحے کی ضرورت ہوتی ہے جو انسان کو بہت ساری زنجیروں سے آزاد کر دیتا ہے۔ سینتیس سالہ زندگی میں آج دوسری بار سالار کی زندگی میں وہ لمحہ آیا تھا۔

پہلی بار مارگلہ کی پہاڑی پر موت کے خوف کی گرفت میں وہ اس طرز زندگی سے تائب ہو گیا تھا جو وہ گزارتا آیا تھا اور آج دوسری بار وہ امامہ اور اپنے بچوں کی موت کے خوف اور ورلڈ بینک میں اپنے سینیئرز کے ہاتھوں ملنے والی ہتک اور تذلیل کے بعد وہ فیصلہ کر بیٹھا تھا جو وہ اب تک کرتے ہوئے جھجکتا اور کتراتا رہا تھا۔

بعض خوف سارے خوف کھا جاتے ہیں۔۔۔ سالار سکندر کے ساتھ بھی اس دن یہ ہی ہوا تھا۔ وہاں بیٹھے اس

نے اس دن یہ طے کیا تھا' وہ اگلے دس سال میں ورلڈ بینک سے بڑا ادارہ بنائے گا۔ وہ دنیا کے اس مالیاتی نظام کو الٹ کر رکھ دے گا جس پر مغرب قابض تھا۔ وہ ساری عمر مغربی اداروں میں مغربی تعلیم حاصل کرتا رہا تھا۔ وہ مغرب کا مداح تھا' لیکن وہ مغرب کا مطیع نہیں بن سکتا تھا۔

ذلت بہت کم لوگوں کو مطیع بناتی ہے۔۔۔ تذلیل لوگوں کو منتقم المزاجی سکھاتی ہے۔۔۔ بدلہ لینے پر مجبور کرتی ہے۔۔۔ سالار' سکندر نے اپنی پروفیشنل زندگی میں پہلی بار ایسی تذلیل چکھی تھی۔۔۔ ہتک۔۔۔ ذلت' تذلیل۔۔۔ جتنے بھی لفظ اس احساس کے لیے استعمال ہو سکتے ہیں۔ اس کو محسوس ہوئے تھے۔۔۔ مغرب کی مشینری کا ایک بہترین اور کارآمد پرزہ بن کر بھی وہ صرف ایک پرزہ ہی بن سکا تھا جس کی مدت میعاد اور ضرورت ختم ہونے پر اسے ناکارہ سمجھ کر پھینک دیا جاتا۔۔۔ وہ ساری عمر یہ سمجھتا رہا تھا۔ وہ اپنی قابلیت' اپنی مہارت' اپنے کام سے جزو لاینفک بن چکا تھا۔ وہ خود کو اہم نہیں "اہم ترین" سمجھتا رہا تھا۔ اس کا یہ یقین خوش فہمی نکلی تھی۔

"تم مزید کسی ایشو کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہو؟" الیگزینڈر رافیل نے بظاہر بے نیازی جتاتے ہوئے اس سے کہا۔

"نہیں۔۔۔" وہ مزید کچھ بھی کہے بغیر اٹھ گیا تھا۔ رافیل بھونچکا رہ گیا تھا۔ وہ اسے اپنے بیوی' بچوں کی زندگی کے لیے گڑگڑاتا دیکھنا چاہتا تھا۔۔۔ اپنے پاسپورٹ کو ایشو کرانے کے لیے ورلڈ بینک کی اپروول اور تعاون کی بھیک مانگتے ہوئے اور پھر آخر کار ان ٹرمز اور کنڈیشنز کو مانتے ہوئے استعفیٰ دینے یا کانگو میں اس پروجیکٹ کو جاری رکھنے کی۔۔۔ جس کے لیے وہ کل یہاں بیٹھا تھا۔ لیکن سالار سکندر ان حالات میں بھی اٹھ کر چلا گیا تھا۔ رافیل کو لگا اس کا ذہنی توازن خراب ہو گیا تھا۔

ہیڈ کوارٹرز کی عمارت سے اس طرح نکلتے ہوئے سالار کو خود بھی یہ ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا ذہنی توازن خراب ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ اتنا بے رحم اور بے حس تو نہیں ہو سکتا تھا کہ امامہ اور بچوں کے لیے وہاں کچھ بھی کیے بغیر آجائے۔ وہ وہاں کمپرومائز کرنے گیا تھا۔ اپنی بیوی اور بچوں کی زندگی بچانے کے لیے ان کی شرائط ماننے کی نیت سے وہاں گیا تھا۔ لیکن رافیل کے الفاظ اور رویے نے جیسے سالار سکندر کا ذہن ہی الٹ کر رکھ دیا تھا۔

"میں ان میں سے کسی سے بھی اپنی فیملی کی زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا۔ اگر گڑگڑاؤں گا تو بھی ان میں سے کسی کے سامنے نہیں گڑگڑاؤں گا۔ عزت اور ذلت دونوں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اللہ نے ہمیشہ مجھے عزت دی ہے۔ ذلت جب بھی میرا مقدر بنی ہے میرے فیصلوں' میرے انتخاب سے بنی ہے۔ میں آج بھی اللہ سے ہی عزت مانگوں گا۔ پھر اگر اللہ مجھے عزت نہیں ذلت دے گا تو میں اللہ کی دی ہوئی ذلت بھی قبول کروں گا' لیکن میں دنیا میں کسی اور شخص سے ذلت نہیں لوں گا۔۔۔ نہ جھکوں گا۔۔۔ نہ کمپرومائز کروں گا۔۔۔ کم از کم اب اس سب کے بعد نہیں۔"

وہ ریت کا ٹیلا بن کر اندر گیا تھا اور آتش فشاں بن کر باہر آیا تھا۔ وہ وہی لمحہ تھا جب اس نے امامہ اور اپنے بچوں کی زندگیاں بھی داؤ پر لگا دی تھیں۔

"امامہ۔۔۔ جبریل۔۔۔ عنایہ۔۔۔ یہ نعمتیں مجھے اللہ نے دی ہیں۔۔۔ کسی انسان سے تو کبھی بھی نہیں ملیں۔۔۔ تو پھر میں انسانوں سے ان کے لیے بھیک کیوں مانگوں۔"

وہ ضدی تھا' لیکن اس نے زندگی میں سوچا کبھی بھی نہیں تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب وہ امامہ اور اپنے بچوں کی زندگیوں کو اپنی ضد کے سامنے قربان کرنے پر تیار ہو جائے گا۔

سالار سکندر کو پھانسنے کے لیے جو پھندا تیار کیا گیا تھا' وہ اس سے بچ کر نکل گیا تھا اور جن لوگوں نے وہ پھندا تیار کیا تھا انہیں اندازہ نہیں تھا۔ بساط کس طرح پلٹنے والی تھی' وہ اس کو مات دینا چاہتے تھے۔ وہ انہیں شہ مات دینا

چاہتا تھا۔

"اور اللہ بے شک بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔"

☆ ☆ ☆

وہ دن ورلڈ بینک کے لیے بہت بڑی خوش خبری لے کر آیا تھا۔ پیٹرس ایباکا کوما کی حالت میں مرگیا تھا۔ سالار سکندر نے وہ خبر بینک سے واپس ہوٹل آکر ٹی وی پر سنی تھی۔ یہ اس کے لیے ایک اور دھچکا تھا۔ مگر یہ وہ خبر تھی جو اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔ وہ پیٹرس ایباکا کی جو حالت دیکھ آیا تھا' اس کے بعد اس کا دوبارہ نارمل ہونا ناممکن تھا۔ لیکن وہ رات ورلڈ بینک کے لیے 'سیاہ ترین رات تھی۔

پیٹرس ایباکا مرنے سے پہلے ورلڈ بینک کی موت کا سامان کر گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ایکسکیوزمی۔۔۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کر بار کی طرف چلی گئی تھی۔ اس کی نظروں نے جیکی کا تعاقب کیا۔ وہ بار کاؤنٹر پر بارٹینڈر سے بات کر رہی تھی۔ اس کے سیاہ بیک لیس لباس سے اس کی سفید خوب صورت پشت کمر کے خم تک نظر آرہی تھی۔

اس نے نظر ہٹاتے ہوئے اپنے سامنے پڑے اورنج ڈرنک کا ایک گھونٹ لیا۔ بہت عرصے کے بعد اس نے کسی عورت کے جسم پر غور کیا تھا اور بہت عرصے کے بعد وہ کسی عورت کے ساتھ اکیلے کسی بار میں بیٹھا تھا۔ وہ ایک ہوٹل کا بار روم تھا' لیکن وہ ایسی کسی جگہ پر بھی بہت عرصے کے بعد آیا تھا۔

وہ ہاتھ میں پکڑے گلاس سے دوسرا گھونٹ لے رہا تھا جب جیکی دو شیمپین گلاسز کے ساتھ واپس آگئی تھی۔

"میں نہیں پیتا۔" اس نے ایک گلاس اپنے سامنے رکھنے پر چونک کر اسے یاد دلایا تھا۔

"یہ شیمپین ہے۔" جیکی نے جواباً" ایک کندھے کو ہلاتے ہوئے بے حد گہری مسکراہٹ کے ساتھ اس سے کہا۔ اس کا اپنا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔

"شیمپین شراب نہیں ہے کیا؟" اس نے جواباً" جیسے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ وہ ٹیبل پر پڑی سگریٹ کی ڈبیا سے اب ایک سگریٹ نکال کر لائٹر کی مدد سے سلگا رہا تھا۔

جیکی نے آگے جھکتے ہوئے بڑی سہولت سے اس کے ہونٹوں میں دبا سگریٹ نکال لیا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کی یہ حرکت بے حد غیر متوقع تھی۔ وہ اب اسی سگریٹ کو اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دبائے بائیں ہاتھ میں شیمپین گلاس پکڑے مسکراتے ہوئے سگریٹ کے کش لے رہی تھی۔

اس نے نظریں چراتے ہوئے سگریٹ کی ڈبیا سے ایک اور سگریٹ نکال لیا۔

"آؤ' ڈانس کریں۔" وہ جیکی کی آفر پر ایک بار پھر چونکا۔ وہ ڈانس فلور پر رقص کرتے چند جوڑوں کو دیکھ رہی تھی۔

بار روم میں اس وقت زیادہ لوگ نہیں تھے اور ان میں سے بھی صرف چند ایک ہی اس ڈانس فلور پر موجود تھے۔ جنہیں واقعی ڈانس کرنا تھا' وہ اسی ہوٹل کے نائٹ کلب میں موجود تھے۔

"میں ڈانس نہیں کرتا۔" اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے لائٹر رکھا۔

"آتا نہیں ہے؟" جیکی ہنسی تھی۔

"پسند نہیں ہے۔" وہ مسکرایا تھا۔ وہ ڈرنک کا گھونٹ بھرتے ہوئے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ اس نے راکھ جھاڑنے کے بہانے نظریں چرائیں۔ جیکی کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی

تھی۔

"شراب کبھی نہیں پی تم نے؟"

اس نے ہاتھ میں پکڑا گلاس میز پر رکھتے ہوئے کچھ آگے جھکتے ہوئے پوچھا۔ اس شخص کی نظریں ایک لمحہ کے لیے گلاس سے الجھی تھیں، پھر اس نے جیکی کو دیکھا۔

"بہت عرصہ پہلے۔" اس نے جیسے اعتراف کیا۔

"شیمپین؟" جیکی نے مصنوعی حیرت کے ساتھ کہا۔

"یہ بھی......" بے تاثر چہرے کے ساتھ اس نے ڈانس فلور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

گلاس دوبارہ اٹھاتے ہوئے سامنے بیٹھے ہوئے مرد کے چہرے پر نظریں جمائے جیکی نے اپنی زندگی میں آنے والے پرکشش ترین مردوں کی فہرست میں اس کا شمار کیا تھا۔ وہ اس فہرست میں سب سے اوپر تھا۔ یہ اس کے جسمانی خدوخال نہیں تھے۔ جو اسے سب میں ممتاز کرتے تھے۔ اس کی زندگی میں شکل وصورت کے اعتبار سے اس سے زیادہ خوب صورت مرد آئے تھے۔ سامنے بیٹھے ہوئے شخص میں کچھ اور تھا جو اسے بے حد منفرد سب سے الگ بنا رہا تھا۔ اس کی بھاری مردانہ آواز، شائستہ رویہ، ذہین، تیز اور گہری آنکھیں اس کی مسکراہٹ یا پھر اس کی تمکنت اور رکھ رکھاؤ، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف ملتفت ہو رہی تھی اور بری طرح ہو رہی تھی اور اس میں اس کا قصور نہیں تھا۔ وہ دعوے سے کہہ سکتی تھی کہ وہ مرد کسی بھی عورت کو متوجہ کر سکتا تھا۔ اس نے اس کے کریکٹر پروفائل میں پڑھا تھا کہ وہ عیاش نہیں تھا۔ اسے حیرت تھی، وہ کیوں نہیں تھا۔ اسے ہونا چاہیے تھا۔ اس پر نظریں جمائے اس نے سوچا اور بالکل اسی لمحے اس شخص نے ڈانس فلور سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔ جیکی کی مسکراہٹ بے اختیار گہری ہوئی تھی۔ وہ بھی بے مقصد مسکرا دیا تھا۔ وہ بہت عرصے کے بعد کسی عورت کی کمپنی کو اتنا انجوائے کر رہا تھا۔ وہ خوب صورت تھی، اسمارٹ تھی اور وہ الجھا ہوا تھا، نہ ہوتا تو یہاں اس وقت دو گھنٹے ایک اجنبی عورت کے ساتھ کبھی نہ بیٹھا ہوتا۔

"تمہاری شیمپین!" جیکی نے اسے ایک بار پھر یاد دلایا۔

"تم لے سکتی ہو۔" اس نے جواباً گلاس کو اس کی طرف بڑھا دیا۔

"تم اگر پہلے پیتے تھے تو اب اس میں کیا برائی نظر آگئی تمہیں؟" جیکی اس بار سنجیدہ ہوئی تھی۔

"لطف حاصل کرنے کے لیے پیتا تھا، جب لطف ملنا ختم ہو گیا تو شراب چھوڑ دی میں نے۔"

وہ اس کی بات پر بے اختیار ہنسی۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ جیکی دونوں ہاتھ ٹیبل پر رکھتے ہوئے آگے جھکی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔

"کیا تم جانتے ہو، مجھے تم میں ایک ساحرانہ کشش محسوس ہوتی ہے۔"

وہ مسکرایا تھا، یوں جیسے اس کے جملے سے محظوظ ہوا ہو۔

"زہے نصیب۔" اس نے جواباً کہا تھا۔

جیکی نے بڑے غیر محسوس انداز میں میز پر رکھے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ ہاتھ ہٹانا چاہتا تھا، لیکن چاہتے ہوئے بھی نہیں ہٹا سکا۔ وہ اس کے ہاتھ کی پشت پر بظاہر غیر محسوس انداز میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ میں پکڑا سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دیا۔ وہ دونوں اب ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے، پھر جیکی نے کہا۔

"کیا تم ایک رات کے تعلق پر یقین رکھتے ہو؟"

جواب فوری آیا تھا۔ "بالکل۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)